اہل سنت کون؟

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

امام قوام السنۃ اسماعیل بن محمد الاصبہانی رحمہ اللہ (م ۵۳۵ھ) اہل سنت کا عقیدہ یوں بیان کرتے ہیں:

''اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اکیلا ہے، نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ کوئی ہم سر، وہ ہمیشہ سے اچھی اچھی صفات سے متصف ہے، وہ صفتِ سمع کے ساتھ سمیع، صفتِ بصر کے ساتھ بصیر، صفتِ علم کے ساتھ علیم اور صفتِ کلام کے ساتھ متکلم ہے، قرآنِ کریم اس کا کلام ہے، وہ پڑھے جانے، لکھے جانے، یاد کیے جانے اور سنے جانے، کسی بھی اعتبار سے مخلوق نہیں، خواہ اس کی کوئی بھی صفت لائی گئی ہو اور کسی بھی چیز کی طرف اس کی اضافت کی گئی ہو۔ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے، جیسا کہ خود اس کا فرمان ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾(طٰہٰ: ۵) ''رحمان عرش پر مستوی ہے۔''

وہ (اللہ تعالیٰ) ہر رات آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، جیسا کہ حدیثِ نبوی (صحیح بخاری: ۷۴۹۴، صحیح مسلم: ۷۵۸) میں آیا ہے، اس کی بہت سی (اچھی اچھی) صفات ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم اور صحیح احادیث میں موجود ہیں، مثلاً چہرہ، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾(القصص: ۸۸) ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، سوائے اس (اللہ تعالیٰ) کے چہرے کے۔''

نیز فرمایا: ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ﴾(الرحمٰن: ۲۷) ''اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا۔''

دو حدیثوں (صحیح بخاری: ۷۲۰۶ وغیرہ) میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: **أعوذ بوجهک ...** ''(اے اللہ!) میں تیرے چہرے کی پناہ پکڑتا ہوں۔۔۔'' جس نے اللہ تعالیٰ کے چہرے کو مخلوقات کے چہرے سے تشبیہ دی، وہ گمراہ و کافر ہو گیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کے چہرے کا انکار کر دیا، وہ بھی انکاری و کافر بن گیا، اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ بھی ہیں، جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے: ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَیَّ﴾(صٓ: ۷۵) ''جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ﴾(المائدۃ: ٦٤) ''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ فراخ ہیں۔'' حدیثِ نبوی میں ہے: **وخلق آدم بيديه .** ''اور اس (اللہ تعالیٰ) نے آدم (علیہ السلام) کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔'' (یہ حدیث ضعیف ہے)

نیز فرمانِ نبوی ہے: **و كلتا يديه يمين .** ''اور اللہ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔''(صحیح مسلم: ۱۸۲۷)

اسی طرح وہ صفاتِ باری تعالیٰ جو (صحیح) احادیث میں آئی ہیں، مثلاً ہتھیلی، قدم، انگلی وغیرہ کا تخیل و تصور میں کوئی صورت لائے بغیر اسی انداز سے اقرار کرنا واجب ہے جس انداز سے حدیث میں وہ بیان ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ رحمت، غضب، ارادہ، مشیئت وغیرہ صفات سے بھی متصف ہے، اطاعات میں اس کا ارادہ اور رضا دونوں چیزیں ہوتی ہیں، جبکہ معاصی میں اس کا ارادہ تو ہوتا ہے، لیکن رضا نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق و رازق کے نام سے مسمّٰی ہے، لیکن یہ عقیدہ نہیں رکھا جائے گا کہ خلق و رزق ازل میں تھے، (یہ عقیدہ بھی رکھا جائے گا کہ) محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں سے بہترین ہیں، اللہ نے آپ ﷺ کو بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا ہے، آپ ﷺ کے تمام اقوال و افعال ہمارے لیے دلیل و حجت ہیں، وہ (اہل سنت) اعتقاد رکھتے ہیں کہ جنت اور جہنم دونوں ہمیشہ رہنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں، دونوں کبھی فنا نہ ہوں گی۔

تمام مومن (روزِ قیامت) اللہ تعالیٰ کو بغیر پردے کے دیکھیں گے، اللہ ان سے بغیر ترجمان کے کلام فرمائے گا، وہ (اہل سنت) اللہ تعالیٰ کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، اچھی بُری تقدیر، قبر کے سوال، شفاعت، حوضِ کوثر، میزان، جہنم پر رکھے گئے پل صراط اور ساری مخلوق کے اس پر سے گزرنے پر ایمان لاتے ہیں، (اہل سنت یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ) جو بھی گناہ گار مؤمن جہنم میں داخل ہوگا، اگر اس کی موت ایمان پر ہوئی ہوگی تو اسے جہنم سے نکال دیا جائے گا۔''(الحجّة فی بیان المَحجّة: ۲/۴۳۲۔۴۳۵)

دینِ اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت پر استوار ہے، یہ شریعتِ مطہرہ کے دو اساسی اور بنیادی اصول ہیں، ان کا ماخذ و مصدر قرآن و حدیث ہے، اہل اسلام کا اجماعی اور اتفاقی عقیدہ ہے کہ قرآن و حدیث دونوں وحی اور دینِ الٰہی ہیں، نیز دونوں اللہ تعالیٰ کی حفاظت سے محفوظ ہیں۔

قرآن مجید : قرآنِ مجید کلامِ رب العالمین ہے، اس کے وحی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، یہ ہر قسم کے ریب و شک سے پاک و منزہ کتابِ مبین ہے، اس کے باوجود ظالموں نے اس کا انکار کیا ہے، اس انکار کو خود قرآنِ کریم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

﴿اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝﴾ (المدثر : ٢٤۔٢٥)

''یہ تو بس ایک مؤثر جادو ہے، یہ تو کسی بشر کی کلام ہے''

ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝﴾ (ص : ٧)

''یہ تو محض اپنی طرف سے گھڑی گئی بات ہے۔''

قارئین کرام! انصاف سے بتائیں کہ ان مشرکوں اور کافروں کی بیزاری سے قرآنِ مجید میں کیا نقص واقع ہوا؟ عیسائی مشنریوں اور آریوں نے تو قرآنِ مجید میں شکوک و شبہات پیدا کیے ہیں اور اس میں اعتراضات بھی وارد کیے ہیں، قادیانیوں نے قرآنِ مجید کو منسوخ کہا ہے، حدیثوں کا انکار کیا، شیعہ نے اس میں تواتر کی حد تک تحریف اور کمی و بیشی کا دعویٰ کیا ہے، وہ تو کہتے ہیں کہ اصلی قرآن سترہ ہزار آیات پر مشتمل ہے، کیا اس سارے پراپیگنڈے کی وجہ سے مسلمان قرآنِ مجید کا انکار کر دیں، جو جواب قرآن کے بارے میں ہوگا، وہی جواب حدیث کے بارے میں ہو جائے گا۔

قرآن مجید اور انکار حدیث :

ہر منکرِ حدیث درحقیقت منکرِ قرآن ہوتا ہے، منکرینِ قرآن اور منکرینِ حدیث دونوں کے مقاصد ایک ہیں کہ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت کا انکار کیا جائے، یہ قرآن و حدیث کے انکار سے ہی ممکن ہے، قرآن کی آڑ میں حدیث کو نشانہ بنایا جائے، حدیث پر اعتراضات وارد کیے جائیں، اس میں شکوک و شبہات پیدا کیے

جائیں، حدیث کو تاریخی حیثیت دے کر اسوۂ رسول ﷺ کے خاتمہ کی سازش کی جائے، حدیث کو عجمی شازش قرار دے کر سرے سے انکار ہی کر دیا جائے، دین کی پیروی کی بجائے خواہشات کی پیروی کو ہوا دی جائے، وہ یوں کہ حدیث کو قرآن پر پیش کریں، اگر یہ بزعم خویش قرآن کے موافق ہے تو حدیث ہے، ورنہ جھوٹی داستان! کبھی یہ راگ الاپا کہ قرآن قطعی ہے اور حدیث ظنی ہے، لہٰذا اس سے عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت ثابت نہیں ہو سکتا، کبھی احادیثِ صحیحہ اور ائمہ کی متفقہ تصریحات کے خلاف قرآنی نصوص میں باطل تاویلات کر کے ان کو خواہشات کا تختۂ مشق بنا دیا، کبھی یہ شور مچایا کہ حدیث تو دو سو سال بعد لکھی گئی ہے، اس پر کیا اعتبار؟ کبھی حدیث کو عقل سقیم کی بھینٹ چڑھا کر اس کا انکار کر دیا۔

خوب یاد رہے کہ ہر باطل مذہب کی یہی پہچان ہے کہ وہ دین کو صرف عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے، الغرض ہر بدبخت اور ظالم نے دل کھول کر حدیثِ رسول ﷺ پر ظلم ڈھایا ہے، ہم اپنے اللہ سے شکایت کرتے ہیں، وہی ان ظالموں کو پوچھے گا۔

باطل فرقے اور انکار قرآن و حدیث :

جہمی فرقہ نے جہاں حدیث کا رد کیا، وہاں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا بھی انکار کیا، معتزلہ فرقہ نے جہاں حدیثیں رد کیں، وہاں قرآن کو بھی مخلوق کہا۔

امام نعیم بن حماد الخزاعی رحمہ اللہ (م ۲۲۸ھ) فرماتے ہیں:

المعتزلة تردّون ألفی حدیث من حدیث النبیّ صَلَّی اللّٰه علیه وسلّم أو نحو ألفی حدیث .

''معتزلہ احادیثِ نبویہ میں سے دو ہزار یا اس کے لگ بھگ احادیث کا انکار کرتے ہیں۔''

(سنن ابی داوٗد ، تحت حدیث : ٤٧٧٢، وسندہٗ صحیح)

اشعری فرقہ نے جہاں احادیثِ نبویہ کو چھوڑا، وہاں قرآنِ کریم کے اللہ تعالیٰ کی حقیقی کلام ہونے کا انکار کر دیا، خارجیوں نے جہاں احادیثِ نبویہ کا انکار کیا، وہاں قرآنِ مجید کی واضح نصوص میں معنوی تحریف اور تاویلِ باطل کے مرتکب ہوئے، کلابیہ فرقہ نے جہاں احادیثِ صحیحہ کو خواہشات کا تختۂ مشق بنایا، وہاں قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کا مجازی کلام قرار دیا، مرجی فرقہ نے جہاں بعض احادیث کا رد کیا، وہاں قرآنِ مجید کی بعض آیاتِ بینات کو مہمل سمجھ لیا، رافضیوں نے جہاں احادیث کا انکار کیا، وہاں قرآن کے محرف ومبدل ہونے کا دعویٰ کر دیا، قادیانیوں نے جہاں احادیث کا انکار کیا، وہاں قرآن کو منسوخ قرار دیا۔

معلوم ہوا کہ ہر گمراہ فرقہ جو حدیث پر ظلم ڈھاتا ہے، وہ ضرور بالضرور قرآنِ مجید کو اپنی خواہشات کے حوالے کر دیتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ رنگ وروپ مختلف ہے، کردار ایک ہی ہے۔

انکار قرآن و حدیث کا ایک نقصان :

منکرینِ قرآن نے نبیٔ اکرم ﷺ کی ذاتِ باصفات کو تنقید کا نشانہ بنایا، منکرینِ حدیث رافضیوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کردار کشی کی، بعض نے جبریل امین سے دشمنی کر لی، منکرینِ حدیث خارجیوں نے صحابہ کرام کی شان میں تنقیص کی، ناصبی منکرینِ حدیث نے اہل بیت کی ذاتِ باصفات کو تنقید کا نشانہ بنایا، ہمارے دور کے منکرینِ حدیث نے ثقہ ائمہ محدثین سلف صالحین اور ثقہ فقہاء و مجتہدین کی تذلیل و توہین کی کوشش کی، محدثین کرام کو جاہل، کم فہم اور قرآن کا دشمن ومخالف قرار دیا۔

اگر نبیٔ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وجودِ مقدس اور محدثین کرام رحمہم اللہ کے وجودِ مبارک کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے تو دینِ اسلام کا وجودِ مسعود باقی نہیں رہ سکتا، منکرینِ حدیث بھی یہی چاہتے ہیں کہ دینِ اسلام کا نام ونشان تک نہ رہے (العیاذ باللہ!)، اس لیے وہ ان نفوسِ مقدسہ کو حدفِ تنقید بناتے ہیں۔

کیا حدیث کی حیثیت تاریخی ہے ؟

کس قدر ناانصافی کی بات ہے کہ حدیثِ رسول ﷺ کو تاریخی حیثیت دے کر دین کے بڑے حصے سے دستبردار ہو جایا جائے؟ جبکہ حدیث کے وحی ہونے پر اجماعِ مسلمین ہے، قرآنی دلائل اس پر شاہد ہیں۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''بلاشبہ جو آدمی اللہ (پر ایمان لاتا ہے) اور یومِ آخرت کی امید رکھتا اور اللہ کا زیادہ ذکر کرتا ہے، اس کے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کا نمونہ کیا ہے؟ وہ حدیث ہی تو ہے، اگر حدیث کی حیثیت غیر تشریعی اور تاریخی ہے تو اسوۂ رسول ﷺ کہاں ہے؟ منکرینِ حدیث کا مقصد بھی یہی ہے کہ اسوۂ رسول ﷺ کا خاتمہ ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر منکرِ حدیث قرآن دشمنی کے در پے ہے، یہ ایسے طریقے سے حدیث کی تردید و تکذیب کرتے ہیں، جس سے قرآن کی تردید وتکذیب لازم آتی ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ رب العزت

نے اپنی عبادت کا حکم تو دیا، لیکن اس کا طریقۂ ادائیگی تاریخ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَأَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ ﴾(النحل: ٤٤)

''اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے لیے ان کی طرف نازل شدہ وحی کی تفسیر وتشریح کر دیں۔''

کیا نبیٔ اکرم ﷺ نے قرآنِ کریم کا بیان پیش کیا ہے؟ اس کی تبیین وتوضیح فرمائی ہے؟ اس کی تفسیر وتشریح کی ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو وہ کہاں ہے؟ اگر حدیث کی تشریعی حیثیت کا انکار کر دیا جائے تو قرآنِ مجید کی اس آیتِ کریمہ کی تکذیب لازم آئے گی، بھلا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ ''حدیث کی حیثیت دینی نہیں، محض تاریخی ہے، جو صبح سے شام تک تبدیل ہو کر کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہے۔''

بھلا سوچیں کہ حدیث کیسی تاریخ ہے جو پوری انسانیت کے لیے سامانِ ہدایت واصلاح مہیا کرتی ہے اور اصلاح وفلاح کے حوالے سے زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے جو معیشت وسیاست اور ادب واخلاق کے دائمی ضابطوں سے مالا مال ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے جو فصاحت وبلاغت، اسلوب واحکام کی بلندی اور دقتِ تعبیر سے لبریز ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے جو حلال وحرام اور طیب وخبیث میں فرق کرتی ہے؟

یہ کیسی تاریخ ہے جو قرآن کی تصدیق کرتی ہے، اس کو وحی برحق قرار دیتی ہے، اس پر عمل کرنے کو کہتی ہے، اس میں اختلاف کرنے سے منع کرتی ہے، اس کی فضیلت بیان کرتی ہے، اس کا معجزۂ خالدہ ہونا تسلیم کرتی ہے اور قرآنِ کریم نے جو تمام اساسی عقائد وعبادات واخلاق بیان کیے ہیں، ان سے سر موانحراف نہیں کرتی؟

یہ کیسی تاریخ ہے جو نماز کے طریقۂ ادائیگی کی تفصیل بیان کرتی ہے، نیز یہ یہاں تک بتاتی ہے کہ ہوا خارج ہو جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے جو رشتوں کی حرمت بیان کرتی ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے کہ اس کی ایک بات کے خلاف بھی مسلمانوں کا اجماع نہ ہو سکا؟ یہ کیسی تاریخ ہے کہ عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ اس کی ہر بات کو تسلیم کرتی ہے؟ یہ کیسی تاریخ ہے کہ اس سے پہلے دنیا کی تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر رہی ہے؟ اور یہ کیسی تاریخ ہے جو کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ثبوت فراہم کرتی ہے؟؟؟

❀❀❀❀❀❀❀

رسول اللہ ﷺ نماز شروع کرتے وقت، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور دو رکعتوں سے اٹھ کر رفع الیدین کرتے تھے، اس کا ترک ثابت نہیں، دلائل ملاحظہ ہوں:

دلیل نمبر ①: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

انّ رسول اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم كان يرفع يديه حذو منكبيه اذا افتتح الصّلاة ، واذا كبّر للرّكوع ، واذا رفع رأسه من الرّكوع رفعهما كذلك أيضا وقال : سمع اللّٰه لمن حمده ، ربّنا ولك الحمد ، وكان لا يفعل ذلك في السّجود .

”بے شک رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو کندھوں کے برابر دونوں ہاتھ اٹھاتے، جب رکوع کے لیے اللہ اکبر کہتے اور جس وقت رکوع سے سر اٹھاتے تو اسی طرح رفع الیدین کرتے تھے اور **سمع اللّٰه لمن حمدهٗ ، ربّنا ولك الحمد** کہتے، سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔“

(صحیح بخاری : ۱۰۲/۱، ح : ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۸، صحیح مسلم : ۱۶۸/۱، ح : ۳۹۰)

راویٔ حدیث کا عمل: سلیمان الشیبانی کہتے ہیں: **رأيت سالم بن عبداللّٰه اذا افتتح الصّلاة رفع يديه ، فلمّا ركع رفع يديه ، فلمّا رفع رأسه رفع يديه ، فسألته ، فقال : رأيت أبي يفعله ، فقال : رأيت رسول اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم يفعله .**

”میں نے سالم بن عبداللہ بن عمر تابعی رحمہ اللہ کو دیکھا کہ انہوں نے جب نماز شروع کی تو رفع الیدین کیا، جب رکوع کیا تو رفع الیدین کیا اور جب رکوع سے سر اٹھایا تو رفع الیدین کیا، میں نے آپ سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا، میں نے اپنے باپ (سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) کو ایسا کرتے دیکھا ہے، انہوں نے فرمایا تھا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔“ (حدیث السراج : ۳۴/۲۔۳۵، ح : ۱۱۵، وسندہٗ صحیح)

سبحان اللہ! کتنی پیاری دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ تا وفات رفع الیدین کرتے رہے، راویٔ حدیث سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کا رفع الیدین ملاحظہ فرمایا، خود بھی رفع الیدین کیا، یہاں تک ان کے بیٹے سالم جو تابعی ہیں، وہ آپ کا رفع الیدین ملاحظہ کر رہے ہیں اور وہ خود بھی رفع الیدین کر رہے

ہیں، اگر رفع الیدین منسوخ ہوگیا تھا تو نبی کریم ﷺ کی امامت میں نمازیں ادا کرنے والے راویٔ حدیث صحابیٔ رسول سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اس نسخ کا علم کیسے نہ ہوا اور سینکڑوں سالوں بعد احناف کو کیسے ہوگیا؟

جناب رشید احمد گنگوہی دیوبندی لکھتے ہیں: ''جو سنت کی محبت سے بلا شر وفساد آمین بالجہر اور رفع الیدین کرے، اس کو برا نہیں جانتا۔'' (تذکرۃ الرشید: ۱۷۵/۲)

اے اللہ! اے زمین وآسمان کو پیدا کرنے والے تو جانتا ہے کہ ہم رفع الیدین اور آمین بالجہر محض تیرے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت سے محبت کی وجہ سے کرتے ہیں!

دلیل نمبر ② : سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نبیٔ اکرم ﷺ کی خدمت میں بیس دن رہے، جب واپس جانے لگے تو نبیٔ کریم ﷺ نے ان کو حکم دیا: صلّوا كما رأيتموني أصلّي .

''نماز ایسے پڑھو، جیسے تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔'' (صحیح بخاری: ۸۸/۱، ح: ٦٣١)

راویٔ حدیث کا عمل : ابوقلابہ تابعی رحمہ اللہ سے روایت ہے:

أنّه رآى مالک بن حويرث اذا صلّى كبّر ورفع يديه ، واذا أراد أن يركع رفع يديه ، واذا رفع رأسه من الرّكوع رفع يديه ، وحدّث أنّ رسول اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم صنع هكذا .

''انہوں نے سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، جب آپ نماز پڑھتے تو اللہ اکبر کہتے اور رفع الیدین کرتے، جب رکوع کو جاتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے اور بیان کرتے کہ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔''

(صحیح بخاری: ۱۰۲/۱، ح: ۷۳۷، صحیح مسلم: ۱٦۸/۱، ح: ۳۹۱)

صحابیٔ رسول سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نبیٔ کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے حکم کے مطابق رفع الیدین کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ نبیٔ اکرم ﷺ کا بھی یہی عمل مبارک تھا، ثابت ہوا کہ نبیٔ اکرم ﷺ تا وفات رفع الیدین کرتے رہے۔

دلیل نمبر ③ : سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب نماز میں داخل ہوئے تو رفع الیدین کیا اور اللہ اکبر کہا، پھر کپڑا لپیٹ لیا، دایاں ہاتھ مبارک بائیں ہاتھ مبارک پر رکھا، جب رکوع کا ارادہ کیا تو اپنے دونوں ہاتھ کپڑے سے نکالے، پھر رفع الیدین کیا اور اللہ اکبر کہا، جب (رکوع کے بعد) سمع اللہ لمن حمدہ کہا تو رفع الیدین کیا، سجدہ دونوں ہتھیلیوں کے

درمیان کیا۔'' (صحیح مسلم: ۱۷۳/۱، ح: ٤٠١)

واضح رہے کہ سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ۹ ہجری میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔

(عمدة القاری از عینی حنفی : ٢٧٤/٥)

ایک وقت کے بعد موسمِ سرما میں دوبارہ آئے اور رفع الیدین کا مشاہدہ کیا۔ (سنن ابی داؤد: ۷۲۷، وسندہٗ حسن)

دلیل نمبر ④ : سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فرض نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم قراءت مکمل کر کے رکوع کا ارادہ کرتے تو رفع الیدین کرتے اور رکوع سے سر اٹھا کر بھی رفع الیدین کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بیٹھے ہوئے رفع الیدین نہیں کرتے تھے، دو رکعتوں سے اٹھ کر بھی رفع الیدین کرتے اور اللہ اکبر کہتے تھے۔'' (سنن ابی داؤد: ۷٤٤، سنن الترمذی: ۳٤۲۳، مسند الامام احمد ۹۳/۱، وسندہٗ حسن)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن صحیح'' کہا ہے، امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ (۵۸۴) نے اسے ''صحیح'' کہا ہے۔

راویٔ حدیث سلیمان بن داؤد الہاشمی رحمہ اللہ کہتے ہیں: **هـذا عـندنا مثل حديث الزّهري عن سالم عن أبيه .** ''ہمارے نزدیک یہ اس طرح کی حدیث ہے جسے امام زہری سالم سے اور وہ اپنے باپ سیدنا عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں۔'' (سنن الترمذی، تحت حدیث: ۳٤۲۳، وسندہٗ صحیح)

اس کے راوی عبدالرحمٰن بن ابی الزناد جمہور کے نزدیک ''ثقہ'' ہیں، جیسا کہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وهو ثقة عند الجمهور ، وتكلّم فيه بعضهم بما لا يقدح فيه .**

''وہ جمہور کے نزدیک ثقہ ہیں، ان پر بعض نے ایسی کلام کی ہے جو موجبِ جرح نہیں۔''

(نتائج الافکار لابن حجر : ٣٠٤)

مدینہ میں اس کی حدیث ''صحیح'' اور عراق میں ''مضطرب'' تھی، اس پر جرح اسی صورت پر محمول ہے، یہ روایت مدنی ہے۔ **والحمد لله !**

دلیل نمبر ⑤ : ابوالزبیر کہتے ہیں: **انّ جابر بن عبد اللّٰه كان اذا افتتح الصّلاة رفع يديه ، واذا ركع ، واذا رفع رأسه من الرّكوع فعل مثل ذلک ، ويقول : رأيت رسول اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم فعل مثل ذلک .**

’’سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ جب نماز شروع کرتے تو رفع الیدین کرتے ، جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو اسی طرح رفع الیدین کرتے اور کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔(سنن ابن ماجه : ٨٦٨، وسندهٔ صحيح)

ابوالزبیر محمد بن مسلم بن تدرس تابعی نے ’’مسند السراج (٩٢)‘‘ میں سماع کی تصریح کر رکھی ہے۔

اب غور فرمائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک تابعی سیدنا جابر صحابیٔ رسول کو رفع الیدین کرتے دیکھ رہے ہیں اور صحابیٔ رسول اسے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک بتا رہے ہیں ، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوڑ دیا تھا تو صحابہ کرام آپ کی وفات کے بعد اس پر کار بند کیوں رہے؟

دلیل نمبر ⑥ : سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

هل أريكم صلاة رسول الله صَلَّى الله عليه وسلّم ؟ فكبّر ورفع يديه ، ثمّ كبّر ورفع يديه للرّكوع ، ثمّ قال : سمع الله لمن حمده ، ثمّ رفع يديه ، ثمّ قال : هكذا فاصنعوا ، ولا يرفع بين السّجدتين . ’’کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں ، آپ رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کہا اور رفع الیدین کیا ، پھر اللہ اکبر کہا اور رکوع کے لیے رفع الیدین کیا ، پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہا اور رفع الیدین کیا ، پھر فرمایا تم ایسا ہی کیا کرو! آپ دو سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔‘‘

(سنن الدارقطني : ٢٩٢/١، ح : ١١١١ ، وسندهٔ صحيح)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ورجاله ثقات .** ’’اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔‘‘

(التلخيص الحبير : ٢١٩/١)

اس حدیث سے ’’بعض الناس‘‘ کا یہ کہنا کہ ’’٩ مقامات پر رفع الیدین کا اثبات اور ١٨ مقامات پر نفی دکھاؤ‘‘ باطل و مردود ٹھہرتا ہے ، کیونکہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد رفع الیدین کر رہے ہیں ، رفع الیدین والی نماز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز قرار دے رہے ہیں ، ہمیں بھی رفع الیدین کرنے کا حکم دے رہے ہیں ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رفع الیدین کرتے دیکھا ، وہاں کیا ، جہاں نہیں دیکھا ، وہاں نہیں کیا۔

دلیل نمبر ⑦ : سیدنا ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ نے دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں

نماز پڑھ کر دکھائی ، نماز شروع کرتے وقت ، رکوع جاتے ، رکوع سے سر اٹھاتے اور دو رکعتوں سے اٹھتے وقت

رفع الیدین کیا تو دس کے دس صحابہ کرام نے کہا:

صدقت ، ھکذا کان یصلّی النبیّ صَلَّی اللّٰہ علیہ وسلّم . ''آپ نے سچ کہا ہے، نبی کریم ﷺ اسی طرح نماز پڑھتے تھے۔''

(مسند الامام احمد : ٤٢٤/٥، سنن ابی داوٗد : ٧٣٠، سنن الترمذی : ٣٠٤، وسندهٗ صحیح)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن صحیح'' کہا ہے، امام ابنِ خزیمہ (٥٨٧)، امام ابن الجارود (١٩٢)، امام ابن حبان (١٨٦٥)، اور حافظ خطابی (معالم السنن : ١٩٤/١) رحمہم اللہ نے اس حدیث کو ''صحیح'' قرار دیا ہے۔

حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی اس کو ''صحیح'' کہا ہے۔ (خلاصۃ الاحکام : ٣٥٣/١)

حافظ ابنِ قیّم الجوزیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **حدیث أبی حمید ھذا حدیث صحیح متلقّی بالقبول ، لا علّۃ لہ ، وقد أعلّہ قوم بما برّأہ اللّٰہ أئمّۃ الحدیث منہ ، ونحن نذکر ما علّلوا بہ ، ثمّ نبیّن فساد تعلیلھم وبطلانہ بعون اللّٰہ ...** ''یہ حدیث صحیح ہے، اسے امت نے صحت وعمل کے لحاظ سے قبول کیا ہے، اس میں کوئی علت نہیں، ہاں! اسے ایک قوم (احناف) نے ایسی علت کے ساتھ معلول کہا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے ائمہ حدیث کو بری کر دیا ہے، ہم ان کی بیان کردہ علتوں کو ذکر کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے ان کا فاسد و باطل ہونا بیان کریں گے۔'' (تھذیب السنن لابن القیم : ٤١٦/٢)

امام محمد بن یحییٰ الذہلی ابوعبداللہ النیسابوری رحمہ اللہ (م ٢٥٨ھ) فرماتے ہیں:

''جو آدمی یہ حدیث سن لے اور پھر رکوع سے پہلے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد رفع الیدین نہ کرے، اس کی نماز ناقص ہے۔'' (صحیح ابن خزیمۃ : ٢٩٨/١، وسندهٗ صحیح)

دلیل نمبر ⑧ : امام ابو اسماعیل محمد بن اسماعیل سلمی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابونعمان محمد بن فضل رحمہ اللہ کی اقتدا میں نماز پڑھی، انہوں نے نماز شروع کرتے وقت، رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کیا، میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا، میں نے امام حماد بن زید رحمہ اللہ کی اقتدا میں نماز پڑھی، انہوں نے نماز شروع کرتے وقت، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کیا، میں نے ان سے اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا، میں نے امام ایوب سختیانی رحمہ اللہ کی اقتدا میں نماز پڑھی، وہ نماز شروع کرتے، رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے تھے، میں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا، میں نے امام عطاء بن ابی رباح کی اقتدا میں نماز پڑھی، وہ نماز

شروع کرتے ، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے تھے، میں نے جب آپ سے اس بارے میں سوال کیا تو امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے فرمایا، میں نے (صحابیٔ رسول) سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز پڑھی ، آپ رضی اللہ عنہ نماز شروع کرتے ، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے تھے، امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کہتے ہیں، میں نے رفع الیدین کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے (اپنے نانا) سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز ادا کی ، آپ رضی اللہ عنہ نماز شروع کرتے ، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے تھے اور (خلیفۂ اول) سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ، میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھی ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے ، رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین فرماتے تھے۔''

(السنن الکبریٰ للبیہقی : ۷۳/۲، وسندہٗ صحیح)

خود امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **رواته ثقات .** ''اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔''

حافظ ذہبی رحمہ اللہ (المهذب فی اختصار السنن الکبیر : ۴۹/۲) **اور حافظ ابنِ حجر** رحمہ اللہ (التلخیص الحبیر : ۲۱۹/۱) نے اس حدیث کے راویوں کو ''ثقہ'' قرار دیا ہے۔

قارئین کرام! اس سنہری کڑی پر غور کریں تو ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی رفع الیدین کرتے تھے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی اس سنت کو اپنانے کی توفیق سے نوازے۔ **آمین یا ربّ العالمین !**

تنبیه : الامام الثقۃ ابو جعفر احمد بن اسحاق بن بہلول البغدادی رحمہ اللہ (م ۳۱۸) بیان کرتے ہیں: ''میں عراقیوں کے مذہب پر تھا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی تکبیر میں اور جب رکوع کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے تھے۔'' (سنن الدارقطنی : ۲۹۲/۱، ح : ۱۱۱۲، وسندہٗ صحیح)

جن لوگوں کے مذہب کی بنیاد بزرگوں کے خوابوں پر ہے، کیا وہ اس ثقہ امام کے خواب کی صورت میں ملنے والے نبوی عمل کو اپنانے کے لیے تیار ہیں؟

الحاصل : رفع الیدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنتِ متواترہ ہے جس کا ترک یا نسخ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ امت کا اسی پر عمل رہا ہے۔
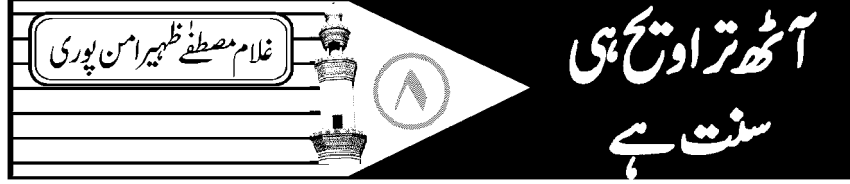
آٹھ رکعت نمازِ تراویح ہی سنت ہے، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں: ''یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی تراویح آٹھ رکعات تھی اور کسی ایک روایت سے بھی ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے رمضان میں تہجد اور تراویح الگ الگ پڑھی ہوں۔'' (العرف الشذی: ۱/۱٦٦)

جناب خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی (م ۱۳٤٦ھ) لکھتے ہیں: ''ابنِ ہمام (نے) آٹھ کو سنت اور زائد کو مستحب لکھا ہے، سو یہ قول قابل طعن کے نہیں۔'' (براهین قاطعه: ۱۸)

مزید لکھتے ہیں: ''سنت مؤکدہ ہونا تراویح کا آٹھ رکعت تو باتفاق ہے، اگر خلاف ہے تو بارہ میں۔'' (براهین قاطعه: ۱۹۵)

جناب اشرف علی تھانوی دیوبندی (۱۲۸۰-۱۳٦۲ھ) کہتے ہیں: ''بیماروں کو تو کہہ دیتا ہوں کہ تراویح آٹھ پڑھو، مگر تندرستوں کو نہیں کہتا۔'' (الکلام الحسن: ۲/۸۹)

جناب عبدالشکور فاروقی لکھنوی دیوبندی (م ۱۳۸۱ھ) لکھتے ہیں: ''اگرچہ نبی کریم ﷺ سے آٹھ تراویح مسنون ہے اور ایک ضعیف روایت میں ابنِ عباس سے بیس رکعت بھی۔''

(علم الفقه از عبد الشکور دیوبندی: ۱۹۸)

یہی بات امامِ احناف ابنِ ہمام حنفی (فتح القدير: ۱/٤٦٨)، امام عینی حنفی (عمدة القاری: ۷/۱۷۷)، امام ابنِ نجیم حنفی (البحر الرائق: ۲/٦٦)، ابنِ عابدین شامی حنفی (رد المحتار: ۱/۵۲۱)، ابوالحسن شرنبلالی حنفی (مراقی الفلاح: ۲۲٤)، طحاوی حنفی (حاشية الطحطاوی علی الدر المختار: ۱/۲۹۵) وغیرہم نے پیش کی ہے۔

حنفی و دیوبندی ''علماء و فقہاء'' کے آٹھ رکعت مسنون تراویح کے فیصلے کے بعد اب ہم انتہائی اختصار کے ساتھ آٹھ رکعت نمازِ تراویح کے سنت ہونے پر دلائل ذکر کرتے ہیں:

دلیل نمبر ①: ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ رمضان المبارک میں رسول اللہ ﷺ کی رات کی نماز (تراویح) کی کیا کیفیت ہوتی تھی؟ تو سیدہ عائشہ

صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: **ما کان رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ علیہ وسلّم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ .** ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان ہوتا یا غیر رمضان، گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔'' (صحیح بخاری : ۱/۱۵٤، ح : ۱۱٤۷، ۱/۲٦۹، ح : ۲۰۱۳، صحیح مسلم : ۱/۲٥٤، ح : ۷۳۸)

جمہور علماء ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے آٹھ رکعت تراویح ثابت کرتے ہیں، جیسا کہ امام ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی (م ٦٥٦ھ) لکھتے ہیں:

ثمّ اختلف فی المختار من عدد القیام .... وقال کثیر من أھل العلم : احدی عشرۃ رکعۃ ، أخذا بحدیث عائشۃ المتقدّم . ''پھر قیام کے عددِ مختار میں اختلاف کیا گیا ہے، کثیر علمائے کرام نے کہا ہے کہ یہ گیارہ رکعت ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا والی اس حدیث سے دلیل لیتے ہوئے جو گزر چکی ہے۔'' (المفھم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم : ۲/۳۸۹۔۳۹۰)

اس حدیث کی شرح میں جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں:

ھذہ الرّوایۃ روایۃ الصّحیحین ، وفی الصّحاح صلاۃ تراویحہ علیہ السّلام ثمانی رکعات ، وفی السّنن الکبریٰ وغیرہ بسند ضعیف من جانب أبی شیبۃ ، فانّہ ضعیف اتّفاقاً ، عشرون رکعۃ، الآن انّما ھو سنّۃ خلفاء الرّاشدین ، ویکون مرفوعاً حکماً وان لم نجد اسنادہ قویّاً .

''یہ صحیح بخاری وصحیح مسلم کی روایت ہے اور صحیح احادیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ تراویح آٹھ رکعت ثابت ہے اور سنن کبریٰ میں بیس رکعتوں والی روایت ضعیف سند کے ساتھ ابوشیبہ سے آئی ہے، جو کہ باتفاق ضعیف ہے اور بیس رکعتیں خلفائے راشدین کی سنت ہے اور مرفوع کے حکم میں ہے، اگرچہ اس کی قوی سند ہمیں نہیں ملی۔'' (العرف الشذی : ۱/۱۰۱)

دیکھئے! شاہ صاحب کس طرح آٹھ رکعت تراویح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح بخاری وصحیح مسلم میں ثابت کر رہے ہیں اور ساتھ ہی حنفی مذہب کی کمزوری ومعذوری پیش کر رہے ہیں کہ ہم بیس رکعت تراویح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قوی سند کے ساتھ نہیں پا سکے، آپ خود اندازہ فرمائیں کہ ایک مسئلہ جو قوی سند کے ساتھ ثابت بھی نہ ہو، پھر صحیح بخاری وصحیح مسلم کی متفق علیہ حدیث کے خلاف بھی ہو، اس کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین سے کسی وضعی (من گھڑت) روایت سے بھی بیس رکعت نمازِ تراویح پڑھنا ثابت نہیں ہے، لہٰذا بیس رکعت تراویح کو خلفائے راشدین کی سنت قرار دینا صریح غلطی ہے۔

جناب انور شاہ کاشمیری دیوبندی کے علاوہ متعدد حنفی فقہاء نے بھی اس حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو آٹھ رکعت تراویح کی دلیل بنایا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ نمازِ تراویح اور تہجد میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ ایک ہی نماز کے دو مختلف نام ہیں۔(تفصیل کیلیے دیکھیں فیض الباری : ۴۲۰/۲ وغیرہ)

دلیل نمبر ② : سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

صلّی بنا رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ علیه وسلّم فی شھر رمضان ثمان رکعات وأوتر .

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ماہِ رمضان میں آٹھ رکعت نمازِ تراویح اور وتر پڑھائے۔''

(مسند ابی یعلیٰ : ۳۲۶/۲، المعجم الصغیر للطبرانی : ۱۹۰/۱، فتح الباری : ۱۲/۳، وسندهٗ حسن)

اس روایت کے راوی عیسیٰ بن جاریہ جمہور محدثین کے نزدیک ''موثق، حسن الحدیث'' ہیں۔ اس حدیث کو امام ابن خزیمہ (۱۰۷۰) اور امام ابن حبان (۲۴۰۹) رحمۃ اللہ علیہما نے ''صحیح'' کہا ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: واسناده وسط . ''اس کی سند اچھی ہے۔''(میزان الاعتدال : ۳۱۱/۳)

امام عینی حنفی(عمدۃ القاری : ۱۷۷/۷)**اور دیگر فقہاء نے اس حدیث کو آٹھ رکعت نمازِ تراویح پر دلیل بنایا ہے۔**

دلیل نمبر ③ : سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی، اے اللہ کے رسول! آج رات مجھ سے ایک کام ہوا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ کیا اے اُبی؟ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کی، میرے گھر کی عورتوں نے مجھے کہا، ہم قرآنِ کریم پڑھی ہوئی نہیں، اس لیے ہم آپ کے ساتھ نماز پڑھیں گی:

فصلّیت بھن ثمان رکعات ، ثمّ أوترت ، فکانت سنّة الرّضا ، ولم یقل شیئاً .

''میں نے انہیں آٹھ رکعت تراویح پڑھائیں، پھر وتر پڑھائے، اس بات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رضامندی کا اظہار فرمایا اور کچھ نہیں کہا۔''(مسند ابی یعلیٰ : ۳۶۲/۲، زوائد مسند الامام احمد : ۱۱۵/۵، المعجم الاوسط للطبرانی : ۱۴۱/۴، قیام اللیل للمروزی : ۲۱۷، وسندهٗ حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (۲۵۵۰) نے ''صحیح'' کہا ہے، حافظ ہیثمی نے اس کی سند کو ''حسن'' کہا ہے۔(مجمع الزوائد : ۷۴/۲)

دلیل نمبر ④ : صحابیٔ رسول سیدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

أمر عمر بن الخطّاب أبیّ بن کعب وتمیماً الدّاریّ أن یقوما للنّاس باحدی عشرة رکعة .

''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابی بن کعب اور سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت نمازِ تراویح (مع وتر) پڑھایا کریں۔'' (مؤطا امام مالك : ۱۳۸، شرح معانی الآثار للطحاوی : ۲۹۳/۱، السنن الکبریٰ للبیهقی : ٤٩٦/٢، مشكاة المصابیح : ٤٠٧/١، وسندهٗ صحیح)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ حکم صحیح بخاری و صحیح مسلم والی حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے موافق ہے، سیدنا امیر المؤمنین، شہیدِ محراب کا حکم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے عین مطابق ہے، اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں آٹھ رکعت تراویح پڑھانے کا حکم دیا تھا اور اس سے بیس رکعت تراویح کے قائلین و عاملین کا رد ہوتا ہے اور ان کا بیس رکعتوں کے سنتِ مؤکدہ ہونے کا مفروضہ باطل ٹھہرتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بیس رکعت نمازِ تراویح اس لیے پڑھتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیس پڑھی تھیں، یہ بات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر بہتان اور سراسر جھوٹ ہے، کسی وضعی (من گھڑت) روایت سے بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بیس رکعت تراویح پڑھنا ثابت نہیں ہے۔

ثابت ہوا کہ عہدِ فاروقی میں آٹھ رکعت تراویح پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع تھا۔

دلیل نمبر ⑤ : سیدنا سائب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

انّ عمر جمع النّاس علی أبیّ وتمیم ، فکانا یصلّیان احدی عشرة رکعة .

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سیدنا ابی بن کعب اور سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہما پر جمع کر دیا، وہ دونوں گیارہ رکعت نمازِ تراویح پڑھاتے تھے۔'' (مصنف ابن ابی شیبة : ۳۹۲/۲ـ۳۹۷، تاریخ المدینة للامام عمر بن شبه : ۷۱۳/۲، وسندهٗ صحیح)

دلیل نمبر ⑥ : سیدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

کنّا نقوم فی زمان عمر بن الخطّاب باحدی عشرة رکعة ....

''ہم (صحابہ) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں گیارہ رکعت (نمازِ تراویح) پڑھتے تھے۔''

(سنن سعید بن منصور بحواله الحاوی للفتاوی للسیوطی : ۳٤٩/۱، حاشیة آثار السنن للنیموی : ۲۵۰، وسندهٗ صحیح)

علامہ سبکی لکھتے ہیں: **اسنادهٗ فی غایة الصّحّة .** ''اس کی سند انتہا درجہ کی صحیح ہے۔''

(شرح المنهاج بحواله الحاوی للفتاوی : ۳۵۰/۱)

مذکورہ بالا دلائل سے ثابت ہوا کہ آٹھ رکعت نمازِ تراویح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابی بن کعب و سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہما کو وتر سمیت گیارہ رکعت نمازِ تراویح پڑھانے کا حکم دیا اور انہوں نے آپ کے حکم کی تعمیل و تکمیل میں گیارہ رکعت نمازِ تراویح پڑھائی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پڑھی۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں بھی سنت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین !

بیس رکعت تراویح کے دلائل کا جائزہ

اب ہم ان لوگوں کے دلائل کا علمی و تحقیقی مختصر، مگر جامع جائزہ پیش کرتے ہیں جو بیس رکعت نمازِ تراویح کو ''سنتِ مؤکدہ'' کہتے ہیں۔

دلیل نمبر ① : سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں بیس رکعتیں اور وتر پڑھا کرتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبة : ۲۹۴/۲، السنن الکبری للبیھقی : ۴۹۶/۲، المعجم الکبیر للطبرانی : ۳۹۳/۱۱، وغیرھم)

تبصرہ : یہ جھوٹی روایت ہے، اس کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان راوی ''متروک الحدیث'' اور ''کذاب'' ہے، جمہور نے اس کی ''تضعیف'' کر رکھی ہے۔

امام زیلعی حنفی لکھتے ہیں: **وھو معلول بأبی شیبة ابراھیم بن عثمان ، جدّ الامام أبی بکر بن أبی شیبة ، وھو متّفق علیٰ ضعفه ، ولیّنه ابن عدیّ فی الکامل ، ثمّ انّه مخالف للحدیث الصّحیح عن أبی سلمة بن عبد الرّحمٰن أنّه سأل عائشة : کیف کانت صلاة رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم فی رمضان ؟ قالت : ما کان یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علیٰ احدٰی عشرة رکعة ..**

''یہ روایت ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان راوی کی وجہ سے معلول (ضعیف) ہے، جو کہ امام ابوبکر بن ابی شیبہ کے دادا ہیں، ان کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے، امام ابن عدی نے بھی الکامل میں ان کو کمزور قرار دیا ہے، پھر یہ اس صحیح حدیث کے مخالف بھی ہے، جس میں ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رمضان میں نماز کے بارے میں سوال کیا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان یا غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔۔'' (نصب الرایة للزیلعی : ۱۵۳/۲)

(ل) جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں: **أمّا النّبیّ صَلَّی اللّٰه علیه وسلّم فصحّ عنه ثمان رکعات وأمّا عشرون رکعة فھو عنه علیه السّلام بسند ضعیف وعلی ضعفه اتّفاق .**

''آٹھ رکعات نمازِ تراویح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہیں اور جو بیس رکعت کی روایت ہے، وہ ضعیف ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔'' (العرف الشذی : ۱۶۶/۱)

بالاتفاق ''ضعیف'' راوی کی روایت وہی پیش کر سکتا ہے جو خود اس کی طرح بالاتفاق ''ضعیف'' ہو۔

(ب) جنابِ عبدالشکور فاروقی دیوبندی نے بھی اس کو ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔(علم الفقہ : ص ۱۹۸)

(ج) ابنِ عابدین شامی حنفی (م۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں: **فضعیف بأبی شیبة ، متّفق علی ضعفه مع مخالفة للصّحیح .** ''یہ حدیث ضعیف ہے ، کیونکہ اس میں راوی ابو شیبہ (ابراہیم بن عثمان) بالاتفاق ضعیف ہے، ساتھ ساتھ یہ حدیث (صحیح بخاری وصحیح مسلم کی) صحیح (حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا) کے بھی خلاف ہے۔''(منحة الخالق : ٦٦/٢)

یہی بات امام ابنِ ہمام حنفی(فتح القدیر : ٤٢٧/١) اور امام عینی حنفی(عمدة القاری : ١٢٨/١١) نے بھی کہی ہے۔

علامہ سیوطی (۸۴۹۔۹۱۱ھ) لکھتے ہیں: **هذا الحدیث ضعیف جدّا ، لا تقوم به حجّة .**

''یہ حدیث سخت ترین ضعیف ہے، اس سے حجت و دلیل قائم نہیں ہوسکتی۔''(المصابیح فی صلاة التراویح : ١٧)

تنبیہ : امامِ بریلویت احمد یار خان گجراتی (۱۳۲۴۔۱۳۹۱ھ) اپنی کتاب ''جاء الحق(٢٤٣/٢)'' میں ''نمازِ جنازہ میں الحمد شریف تلاوت نہ کرو'' کی بحث میں امام ترمذی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

''ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ منکرِ حدیث ہے۔''

لیکن اپنی اسی کتاب(٤٤٧/١) کے ضمیمہ میں مندرج رسالہ لمعات المصابیح علی رکعات التراویح میں اس کی حدیث کو بطورِ حجت پیش کرتے ہیں، دراصل انصاف کو ان سے شکایت ہے کہ وہ اس کا ساتھ نہیں دیتے، ایسے بددیانت اور جاہل، بلکہ اجہل لوگوں سے خیر کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے جو اس طرح کی واہی تباہی مچاتے ہیں؟

قارئین کرام! بعض الناس کی یہ کل کائنات تھی جس کا حشر آپ نے دیکھ لیا ہے، نہ معلوم اس کے باوجود ان لوگوں کو بیس رکعات نمازِ تراویح کو ''سنتِ مؤکدہ'' کہتے ہوئے شرم کیوں نہیں آتی؟

دلیل نمبر ② : سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رمضان المبارک میں ایک رات نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام باہر تشریف لائے اور صحابہ کرام کو چوبیس رکعتیں پڑھائیں اور تین رکعات وتر پڑھے۔

(تاریخ جرجان لابی قاسم حمزة بن یوسف السهمی المتوفی ٧٢٧ من الهجریة : ص ٢٧٥)

تبصرہ : یہ روایت جھوٹ کا پلندا ہے، اس میں دو راوی عمر بن ہارون البلخی اور محمد بن حمید الرازی ''متروک و کذاب'' ہیں، نیز ایک غیر معروف راوی بھی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بیس تراویح کے سنتِ مؤکدہ ہونے کا راگ الاپنے والے اس چوبیس والی حدیث

کوکس منہ سے پیش کرتے ہیں؟

دلیل نمبر ③ : سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ رمضان میں رات کولوگوں کونماز پڑھایا کریں، آپ نے فرمایا، لوگ دن میں روزہ رکھتے ہیں، لیکن اچھی طرح قراءت نہیں کرسکتے، اگرتم رات کوان پرقرآن پڑھا کروتو اچھا ہو، سیدنا ابی بن کعب نے عرض کی، اے امیرالمؤمنین! پہلے ایسا نہیں ہوا تو آپ نے فرمایا، مجھے بھی معلوم ہے، تاہم یہ ایک اچھی چیز ہے، چنانچہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کوبیس رکعات پڑھائیں۔(کنز العمال : ٤٠٩/٨)

تبصرہ : ''کنز العمال'' میں اس کی سند مذکور نہیں، دین سند کا نام ہے، بے سند روایات وہی پیش کرتے ہیں، جن کی اپنی کوئی ''سند'' نہ ہو۔

دلیل نمبر ④ : عن الحسن أنّ عمر بن الخطّاب رضی اللّٰہ عنہ جمع النّاس علی أبیّ بن کعب ، فکان یصلّی لھم عشرین رکعۃ . ''حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کوسیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پراکٹھا کیا، وہ انہیں بیس رکعات پڑھاتے تھے۔''

(سنن ابی داوٗد ، سیر اعلام النبلاء : ٤٠٠/١٠، جامع المسانید والسنن للحافظ ابن کثیر : ٥٥/١)

تبصرہ : ① عشرین رکعۃ کے الفاظ دیوبندی تحریف ہے، محمود الحسن دیوبندی (١٢٦٨۔١٣٣٩ھ) نے یہ تحریف کی ہے، عشرین لیلۃ ''بیس راتیں'' کی بجائے عشرین رکعۃ ''بیس رکعتیں'' کردیا ہے۔

جبکہ سنن ابی داوٗد کے کسی نسخہ میں عشرین رکعۃ نہیں ہے، تمام نسخوں میں عشرین لیلۃ ہی ہے، حال ہی میں محمد عوامہ کی تحقیق سے جو سنن ابی داوٗد کا نسخہ چھپا ہے، جس میں سات آٹھ نسخوں کو سامنے رکھا گیا ہے، اس میں بھی عشرین لیلۃ ہی ہے، محمد عوامہ لکھتے ہیں: من الأصول کلّھا .

''سارے کے سارے بنیادی نسخوں میں یہی الفاظ ہیں۔''(سنن ابی داوٗد بتحقیق محمد عوامہ : ٢٥٦/٢)

عشرین رکعۃ کے الفاظ محرف ہونے پرایک زبردست دلیل یہ بھی ہے کہ امام بیہقی رحمہ اللہ (السنن الکبریٰ : ٤٩٨/٢) نے یہی روایت امام ابوداوٗد رحمہ اللہ کی سند سے ذکر کی ہے اوراس میں عشرین لیلۃً کے الفاظ ہیں۔

یہی الفاظ حنفی فقہاء اپنی کتابوں میں ذکر کرتے رہے ہیں۔

رہا مسئلہ ''سیراعلام النبلاء'' اور ''جامع المسانید والسنن'' میں عشرین رکعۃ کے الفاظ کا پایا جانا

تو یہ ناسخین کی غلطی ہے، کیونکہ سنن ابی داوٗد کے کسی نسخے میں یہ الفاظ نہیں ہیں، یہاں تک کہ امام عینی حنفی (م۸۵۵ھ) نے ''شرح أبي داؤد (۳٤۳/٥)'' میں عشرین لیلة کے الفاظ ذکر کیے ہیں، نسخوں کا اختلاف ذکر نہیں کیا، اگر رکعة کے الفاظ کسی نسخے میں ہوتے تو امام عینی حنفی ضرور بالضرور نقل کرتے، اسی لیے غالی حنفی نیموی (م۱۳۲۲ھ) نے بھی اس کو بیس رکعت تراویح کی دلیلوں میں ذکر نہیں کیا۔

② اگر مقلدین کی بات کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی یہ روایت ان کی دلیل نہیں بن سکتی، جیسا کہ خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی صاحب (۱۲۶۹۔۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں کہ ایک عبارت بعض نسخوں میں ہو اور بعض میں نہ ہو تو وہ مشکوک ہوتی ہے۔(بذل المجهود: ٤٧٧/٤، بيروت)

لہٰذا اس دیوبندی اصول سے بھی یہ روایت مشکوک ہوئی۔

تنبیہ: امامِ بریلویت احمد یار خان نعیمی گجراتی (۱۳۲۴۔۱۳۹۱ھ) نے عشرین لیلة کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔(«جاء الحق»: ٩٥/٢، بحث «قنوتِ نازله پڑهنا منع هے»)

جناب سرفراز خان صفدر دیوبندی ایک دوسری روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جب عام اور متداول نسخوں میں یہ عبارت نہیں تو شاذ اور غیر مطبوعہ نسخوں کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟''

(خزائن السنن: ٩٧/٢)

مقلدین کے اصول کے مطابق اس روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔

③ امام زیلعی حنفی (م۷۶۲ھ) اور امام عینی حنفی لکھتے ہیں: **لم يدرك عمر بن الخطّاب .**

''اس روایت کے راوی امام حسن بصری رحمہ اللہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔''

(نصب الراية: ١٢٦/٢، شرح ابى داوٗد از عينى حنفى: ٣٤٣/٥)

لہٰذا یہ روایت ''منقطع'' ہوئی، کیا شریعت ''منقطع'' روایات کا نام ہے؟

④ امام عینی حنفی نے اس کو ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔(شرح سنن ابى داوٗد از عينى حنفى: ٣٤٣/٥)

⑤ اس روایت کو حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی ''ضعیف'' کہا ہے۔(خلاصة الاحكام للنووى: ٥٦٥/١)

⑥ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا گیارہ رکعت تراویح بمع وتر کا حکم دینا ثابت ہے۔

(موطا امام مالك: ١٣٨، السنن الكبرىٰ للبيهقى: ٤٩٦/٢، شرح معانى الآثار للطحاوى: ٢٩٣/١، معرفة السنن والآثار للبيهقى: ٤٢/٤، فضائل الاوقات للبيهقى: ٢٧٤، قيام الليل للمروزى: ٢٢٠، مشكاة المصابيح: ٤٠٧/١، وسندهٗ صحيح)

امام طحاوی حنفی (۲۳۹۔۳۲۱ھ) نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے

دلیل نمبر ④ : یزید بن رومان کہتے ہیں کہ لوگ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں رمضان میں تئیس رکعات پڑھا کرتے تھے۔(مؤطا امام مالك : ۹۸/۱، السنن الكبرٰى للبيهقى : ۴۹۶/۲)

تبصرہ : یہ روایت ''انقطاع'' کی وجہ سے ''ضعیف'' ہے، کیونکہ راوی یزید بن رومان نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ ہی نہیں پایا، امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **يزيد بن رومان لم يدرك عمر بن الخطّاب .** ''یزید بن رومان نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔''(نصب الراية للزيلعى : ۱۶۳/۲)

لہٰذا یہ روایت ''منقطع'' ہوئی، جبکہ مؤطا امام مالک میں اس ''منقطع'' روایت سے متصل پہلے ہی ''صحیح و متصل'' سند کے ساتھ ثابت ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے گیارہ رکعت کا حکم دیا تھا۔

جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں: **ترجيح المتّصل على المنقطع .**

''ضابطہ یہ ہے کہ متصل کو منقطع پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔''(العرف الشذى : ۱۱)

ہم کہتے ہیں کہ یہاں بے ضابطگیاں کیوں؟ جناب اشرف علی تھانوی دیوبندی اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''روایتِ مؤطا مالک منقطع ہے۔''(اشرف الجواب : ۱۷۲)

صحیح احادیث کے مقابلہ میں ''منقطع'' روایت سے حجت پکڑنا انصاف کا خون کرنے کے مترادف ہے۔

دلیل نمبر ⑤ : یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے۔(مصنف ابن ابى شيبة : ۳۹۳/۲)

تبصرہ : یہ روایت ''منقطع'' ہونے کی وجہ سے ''ضعیف'' ہے، نیموی حنفی لکھتے ہیں:

يحيى بن سعيد لم يدرك عمر . ''یحییٰ بن سعید الانصاری نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔''(التعليق الحسن از نيموى حنفى : ۲۵۳)

دلیل نمبر ⑥ : عبدالعزیز بن رفیع فرماتے ہیں کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رمضان میں لوگوں کو مدینہ میں بیس رکعات پڑھاتے تھے اور وتر تین رکعات۔(مصنف ابن ابى شيبة : ۳۹۳/۲)

تبصرہ : یہ روایت بھی ''انقطاع'' کی وجہ سے ''ضعیف'' ہے، نیموی حنفی لکھتے ہیں:

عبد العزيز بن رفيع لم يدرك أبيّ بن كعب . ''عبدالعزیز بن رفیع نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔''(التعليق الحسن : ۲۵۳)

دلیل نمبر ⑦ : سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں رمضان میں بیس رکعتیں پڑھتے تھے۔(مسند علی بن الجعد : ۲۸۲۵، السنن الکبریٰ للبیہقی : ۴۹۶/۲، وسندہٗ صحیح)

تبصرہ : یہ بیس رکعتیں پڑھنے والے لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے علاوہ اور لوگ تھے، کیونکہ صحابیٔ رسول سیدنا سائب بن یزید خود فرماتے ہیں: **کنّا (أی الصّحابة) نقوم فی عهد عمر بن الخطّاب باحدیٰ عشرة رکعة ...** ''ہم (صحابہ) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں گیارہ رکعات (نمازِ تراویح بمع وتر) پڑھتے تھے۔''(حاشیة آثار السنن : ۲۵۰، وسندہٗ صحیح)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے علاوہ دوسرے لوگوں کا عمل حجت نہیں، یہ کہاں ہے کہ یہ نامعلوم لوگ بیس کو سنتِ مؤکدہ سمجھ کر پڑھتے تھے، اگر کوئی آٹھ کو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور بارہ کو زائد نفل سمجھ کر پڑھے تو صحیح ہے، یہ لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔

جناب خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی (م ۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں: ''ابنِ ہمام (نے) آٹھ رکعات کو سنت اور زائد کو مستحب لکھا ہے، سو یہ قول قابل طعن کے نہیں۔''(براهین قاطعه : ۱۸)

مزید لکھتے ہیں: ''سنتِ مؤکدہ ہونا تراویح کا آٹھ رکعت تو باتفاق ہے، اگر خلاف ہے تو بارہ میں۔''(براهین قاطعه : ۱۹۵)

دلیل نمبر ⑧ : سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بیس رکعات تراویح اور وتر پڑھا کرتے تھے۔(معرفة السنن والآثار للبیهقی : ۴۲/۴)

تبصرہ : یہ روایت ''شاذ'' ہے، امام مالک، امام یحییٰ بن سعید القطان اور امام الدراوردی وغیرہم رحمہم اللہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے اس میں ''شذوذ'' ہے، اگرچہ خالد بن مخلد ''ثقہ'' راوی ہے، لیکن کبار ثقات کی مخالفت کرنے کی وجہ سے اس کی روایت قبول نہ ہوگی، اسی روایت میں کبار ثقات گیارہ رکعات بیان کر رہے ہیں۔

دلیل نمبر ⑨ : ابوعبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں قراء کو بلایا اور ان کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ انہیں وتر پڑھاتے تھے۔
(السنن الکبریٰ للبیہقی : ۴۹۶/۲)

تبصرہ : (ا) یہ روایت ''ضعیف'' ہے، اس کی سند میں حماد بن شعیب راوی ''ضعیف'' ہے، اس کو امام یحییٰ بن معین، امام ابوزرعہ، امام نسائی اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ''ضعیف'' کہا ہے۔

(ب) دوسری وجۂ ضعف یہ ہے کہ عطاء بن السائب ''مختلط'' راوی ہے، حماد بن شعیب ان لوگوں میں سے نہیں، جنہوں نے اس سے قبل الاختلاط سنا ہے۔

دلیل نمبر ⑩ : ابوالحسناء سے روایت ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو پانچ ترویحے، یعنی بیس رکعات تراویح پڑھایا کرے۔ (مصنف ابن ابی شیبۃ : ۳۹۳/۲)

تبصرہ : اس روایت کی سند ''ضعیف'' ہے، اس کی سند میں ابوالحسناء راوی ''مجہول'' ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **لا یُعرف .** ''یہ غیر معروف راوی ہے۔'' (میزان الاعتدال : ٥١٥/٤)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں غیر معروف راویوں کی روایات کا مکلّف نہیں ٹھہرایا۔

دلیل نمبر ⑪ : اعمش کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیس رکعات تراویح پڑھا کرتے تھے۔'' (مختصر قیام اللیل للمروزی : ١٥٧)

تبصرہ: اس کی سند ''ضعیف'' ہے، عمدۃ القاری (۱۲۷/۱۱) میں یہ **حفص بن غیاث عن الأعمش** کے طریق سے ہے، جبکہ حفص بن غیاث اور اعمش دونوں زبردست ''مدلس'' ہیں اور ''عن'' سے بیان کر رہے ہیں، لہٰذا سند ''ضعیف'' ہے۔

باقی امام عطاء، امام ابن ابی ملیکہ، امام سوید بن غفلہ وغیرہم کا بیس رکعت پڑھنا بعض الناس کو مفید نہیں، وہ یہ بتائیں کہ وہ امام ابوحنیفہ کے مقلد ہیں یا امام عطاء ابن ابی رباح وغیرہ کے؟ اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ بیس رکعت کو سنتِ مؤکدہ سمجھ کر پڑھتے تھے۔

آلِ تقلید پر لازم ہے کہ وہ باسندِ صحیح اپنے امام ابوحنیفہ سے بیس رکعت تراویح کا جواز یا سنتِ مؤکدہ ہونا ثابت کریں، ورنہ مانیں کہ وہ اندھی تقلید میں سرگرداں ہیں۔

الحاصل : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صحابی سے بیس رکعت نمازِ تراویح پڑھنا قطعاً ثابت نہیں ہے، سنت صرف آٹھ رکعات ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں حق سمجھنے والا اور اس پر ڈٹ جانے والا بنائے۔ آمین !

اعتراض نمبر ⑦ : منکرِ حدیث صاحب صحیح بخاری پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ بھی حضرت عائشہ کی بیان کردہ بات نہیں ہے اور ہرگز ایسا نہیں ہوا کہ ایک ماہ کی طویل بیماری کے زمانہ میں حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایسی بے التفاتی برتی ہو، کیونکہ شرعاً اس بے التفاتی کی کوئی وجہ نہ تھی، بیمار پر تو سنگ دل لوگوں کو بھی رحم آتا ہے، اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ حضرت ام المؤمنین پر واقعی کچھ لوگ الزام لگا رہے تھے تو بلا شبہ ان کے پاس کوئی ثبوت تو نہ تھا کہ ام المؤمنین کو واقعی مجرم قرار دے کر نفرت و اعراض کا مظاہرہ کرنے کی گنجائش ہوتی۔ کسی شخص پر بغیر کسی ثبوت کے الزام لگایا جائے تو وہ مظلوم ہے، پس ام المؤمنین خود نبیٔ اکرم ﷺ کے علم میں بھی قانونِ شرع کی رو سے مظلوم تھیں اور وہ مظلوم ہستی بیمار بھی پڑی ہوئی تھی۔ تو کیا یہ بات تصوّر کرنے کے لائق ہے کہ رحمت للعالمین ﷺ اپنے گھر میں بیمار پڑی ہوئی مظلوم بیوی کو بلا وجہ اعراض و بے التفاتی کی سزا دیتے دیں۔ سُبْحَانَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ .''

(«صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱/۱۵۱۔۱۵۲)

جواب : قارئین کرام! منکرینِ حدیث کے اس اعتراض کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ سچ ہے تو بغیر ثبوت کے ایک بات کو سن کر آپ ﷺ پورا مہینہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بے التفاتی کیوں کرتے رہے؟ یہ اعتراض عقل و نقل دونوں اعتبار سے واضح طور پر باطل ہے، عقل کے اعتبار سے تو اس طرح کہ ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے کہ رسولِ کریم ﷺ ان دنوں بے حد پریشان تھے، لہٰذا اس حدیث میں جس بے التفاتی کا تذکرہ ہے، وہ ''نفرت و اعراض'' کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ آپ ﷺ کی بے حد پریشانی کی وجہ سے تھی، ظاہر ہے کہ آدمی پریشانی میں کسی کی طرف وہ التفات نہیں کر سکتا جو عام حالت میں ہوتا ہے اور نقل کے اعتبار سے اس طرح یہ اعتراض ناقابلِ التفات ہے کہ اسی حدیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ان دنوں میں جاتے تو ان کا حال دریافت فرماتے تھے، آپ فرماتی ہیں:

ويريبني في وجعي انّي لا أرى من النّبيّ صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم اللّطف الّذي كنت أرى منه

حين أمرض ، انّما يدخل ، فيسلّم ، ثمّ يقول : كيف تيكم ؟

''میری تکلیف کے دوران مجھے یہ چیز شک میں ڈالتی تھی کہ میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے وہ لطف و کرم نہیں دیکھ رہی تھی جو (عام دنوں میں) بیماری کے دوران دیکھتی تھی ، آپ ﷺ تشریف لاتے اور سلام کہتے ، پھر فرماتے ، تمہارا کیا حال ہے؟''

اس روایت سے تو بالکل وضاحت ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ناراض نہ تھے:

وقد انتهى الحديث الى رسول اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم والى أبوىّ ، ولا يذكران لى من ذلك قليلا ولا كثيرا ، الّا انّى قد انكرت من رسول اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم بعض لطفه بى...

''یہ بات رسول اللہ ﷺ اور میرے والدین تک پہنچ چکی تھی ، لیکن وہ مجھ سے اس بارے میں کچھ بھی بات نہ کرتے تھے ، ہاں ! ایک بات تھی کہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لطف و کرم کی کچھ کمی محسوس کر رہی تھی۔۔۔'' (تاریخ الامم والملوك للطبری : ۱۱۲/۲، وسندہٗ صحیح)

اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہے کہ آپ ﷺ ان دنوں میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف بھی لاتے ، سلام بھی کہتے اور حال بھی دریافت کرتے ، بس پریشانی میں ہر انسان کو جو صورتِ حال لاحق ہو جاتی ہے ، وہ آپ ﷺ کو بھی لاحق ہو گئی ، جس کی بنا پر آپ پہلے کی طرح التفات نہ کر سکے اور یہ آپ کے بس کی بات بھی نہ تھی ، ورنہ تہمت لگنے کے بعد بھی آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بے گناہ اور اس الزام کو بے ثبوت ہی سمجھتے تھے ، جیسا کہ اسی حدیث کے الفاظ ہیں ، آپ نے صحابہ سے فرمایا:

من يعذرنى من رجل بلغنى أذاه فى أهلى ، فواللّٰه ! ما علمت علىٰ أهلى الّا خيرا ، وقد ذكروا رجلا ما علمت الّا خيرا .....

''جس آدمی (عبداللہ بن اُبی) کی طرف سے میری بیوی کے بارے میں مجھے تکلیف پہنچی ہے ، اس سے مجھے انصاف کون دلائے گا ، اللہ کی قسم ! میں اپنی بیوی کے بارے میں صرف اچھائی ہی جانتا ہوں ، انہوں (تہمت لگانے والوں) نے ایسے آدمی کا نام لیا ہے کہ جس کے بارے میں صرف اچھائی ہی جانتا ہوں۔۔۔''

ثابت ہوا کہ صحیح بخاری پر کیے گئے اس اعتراض کی کوئی عقلی و نقلی حیثیت نہیں۔

اعتراض نمبر ⑧ : سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے رسولِ کریم ﷺ نے اس معاملے میں جو مشورہ کیا تھا ، اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اسامہ بن زید اس وقت جب کا یہ

قصہ بتایا جاتا ہے، چودہ پندرہ سال کے لڑکے تھے، ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ موجود تھے، جنہیں حضورِ اکرم ﷺ نے ظہورِ نبوت سے قبل ہی اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور سورۂ احزاب کے نزول تک وہ زید بن محمد ہی کہے جاتے تھے، پس اگر آپ کو اپنے اس خانگی امر میں مشورہ لینا ہی تھا تو اسامہ کی بجائے ان کے والد حضرت زید بن حارثہ سے لیتے۔ ایسے اہم امر میں کہیں نوعمر لڑکوں سے مشورہ لیا جاتا ہے ۔۔۔‘‘ (’’مطالعہ‘‘: ۱/۱۵۴)

جواب: چودہ پندرہ سال کا لڑکا یقیناً بالغ ہو جاتا ہے، خصوصاً عرب علاقوں میں تو اپنے قریبی عاقل و بالغ آدمی سے مشورہ کرنے میں کیا حرج ہے، نیز یتیموں کی پرورش کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کے حوالے نہ کرو کہ بچے ہونے کی وجہ سے عقل کی کمی کی بنا پر وہ اسے ضائع کر دیں گے، لیکن جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں تو خود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ فوراً ان کا مال ان کے حوالے کر دیا جائے، جب اللہ تعالیٰ بالغ آدمی کی عقل و دانش کا اعتبار کرتا ہے تو اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اسی کام کے کیے جانے پر اعتراض کیوں ہے؟

چودہ پندرہ سال کا لڑکا اگر زیرک اور روشن دماغ ہو تو اکثر وہ بڑی عمر والوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر سوچ سکتا ہے، خصوصاً جب وہ سید المرسلین کا تربیت یافتہ ہو اور ’’حِبِّ رسول‘‘ (رسولِ کریم ﷺ کا محبوب) کے لقب سے معروف ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ بھی اگر میرٹھی صاحب کے ذہن میں ہوتا جو صحیح بخاری و صحیح مسلم میں موجود ہے تو شاید وہ یہ اعتراض نہ کرتے، رسول اللہ ﷺ نے اس سدا بہار درخت کے بارے میں سوال کیا جس کے پتے کسی موسم میں بھی نہیں گرتے تو سب صحابہ میں سے صرف ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اس سوال کا جواب آیا تھا، حالانکہ وہ اس وقت سب سے چھوٹے تھے۔ (صحیح بخاری: ٦١، صحیح مسلم: ۲۸۱۱)

اب بھی اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے تو یہ سوائے ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں۔

اعتراض نمبر ⑨: ’’پھر حضورِ اکرم ﷺ کو وحی کا کیا انتظار تھا؟ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت ام المؤمنین پر بہتان لگایا گیا تھا تو یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہ تھا کہ وحیٔ جدید نازل ہو کر اسے حل کرتی۔ افک سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نازل فرما دیا تھا کہ جو لوگ پارسا عورتوں پر الزام لگائیں اور ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کریں تو انہیں اسّی کوڑے مارو اور عمر بھر کے لیے مردود الشہادۃ قرار دے دو اور وہ فاسق ہیں۔ حضرت ام المؤمنین کے مسئلہ میں آپ کو اسی پر عمل کرنا تھا، کیونکہ الزام لگانے والوں کے پاس

ثبوت نام کی تو کوئی چیز تھی نہیں۔۔۔۔ایک ماہ تک آپ کا کڑھن اور کبیدگی میں رہنا اور وحی کا انتظار فرمانا اور قرآن کا صاف وصریح حکم نافذ نہ کرنا ہرگز سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔۔۔'' (((مطالعہ)) : ۱/۱۵۵)

جواب : ① دینی امور میں نبی کریم ﷺ کا ہر قول وفعل وحیِ الٰہی سے صادر ہوتا تھا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم: ۳۔۴) ''آپ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، وہ تو بس وحیِ الٰہی ہوتی ہے۔''

ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ کا اس معاملے میں یہ توقف وحیِ الٰہی کی بنا پر تھا، آپ ﷺ کو اسی طرح حکمِ باری تعالیٰ تھا اور ضروری نہیں کہ توقف کا یہ حکم قرآن میں ہی ملے تو تب ہی ایمان لایا جائے، بلکہ امت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ حدیث بھی وحی ہے، جس طرح قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے احکامات نازل ہوتے تھے، اسی طرح حدیث میں بھی نازل ہوتے تھے، ہم اس کی ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

جب غزوۂ بنی نضیر کے موقع پر آپ ﷺ نے اس یہودی قبیلے کے کھجوروں کے کچھ درخت کاٹ دیئے اور کچھ جلا دیئے، اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اُدھر پیغمبر اسلام فساد فی الارض اور مال کے ضیاع سے منع فرماتے ہیں اور ادھر عملاً خود اس کی خلاف ورزی میں اتنا قیمتی مال ضائع کر رہے ہیں، اس وقت یہ فرمانِ باری تعالیٰ نازل ہوا: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِيْنَ ۝﴾(الحشر: ۵) ''جو کھجور کا درخت بھی تم نے کاٹا ہے یا جس کو بھی تم نے اپنے تنے پر (کھڑا) چھوڑ دیا ہے، وہ اللہ کے حکم سے ہے اور تا کہ اللہ فاسقوں کو رسوا کر دے۔''

اب جو شخص مطالبہ کرتا ہے کہ واقعہ افک میں آپ ﷺ کے اس توقف کا حکم قرآنِ کریم سے دکھایا جائے، ہم اس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہمیں غزوۂ بنی نضیر کے کچھ درخت کاٹنے اور کچھ جلانے کا حکم قرآن سے دکھا دے، حالانکہ مذکورہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔

اگر یہ حکم قرآنِ کریم میں نہیں ملتا تو واضح ہے حدیثِ نبوی کی صورت میں یہ وحیِ الٰہی نازل ہوئی تھی، بعینہٖ اس معاملے میں بھی توقف کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا، اتنی سی بات اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس میں امام بخاری اور صحیح بخاری کا کوئی قصور نہیں۔

② یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر ایک معاملے میں پہلا حکم موجود ہوتا تو نبی کریم ﷺ فوراً اسی پر عمل کرتے

تھے بلکہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ نیا حکم بھی نازل فرما دیتے تھے، میرٹھی صاحب نے سورۂ نور کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے، اسی پر ہی میں غور کرنے سے مسئلہ حل ہوسکتا ہے، وہ اس طرح کہ پہلا عام حکم یہ تھا کہ جو آدمی کسی مسلمان عورت پر تہمت لگاتا اور چار گواہ نہ لاسکتا تو اسے اسّی کوڑے لگائے جاتے تھے، لیکن جب ایک خاوند اپنی بیوی کے بارے میں یہ شکایت رسولِ کریم ﷺ کی خدمت میں لایا اور اس کے پاس چار گواہ نہ تھے، اب عمومی حکم تو موجود تھا کہ اسے اسّی کوڑے مار کر مردود الشہادہ قرار دے دیا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے اس خصوصی واقعہ کی وجہ سے اپنا عمومی حکم بدل دیا اور آیاتِ لعان نازل فرما دیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی بیویوں کا معاملہ عام عورتوں سے مختلف ہونا تو خود اللہ تعالیٰ نے قرانِ کریم میں بایں الفاظ بیان فرمادیا ہے : ﴿يٰنِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ﴾(الاحزاب: ٣٢)

''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی عورت کی طرح نہیں ہو۔۔۔''

جب قرآنِ کریم سے نبی ﷺ کی بیویوں کے معاملے کا خاص ہونا ثابت ہو گیا ہے تو بھلا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام کے معاملہ میں آپ ﷺ کا پُرانا قانون لاگو نہ فرمانا سمجھ میں نہ آنے والی بات کیسے ہوگئی ؟

③ عام عورت پر الزام کی صورت میں تہمت لگانے والے پر اسّی کوڑوں کی سزا لاگو ہونے کے باوجود لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ رہ جاتا ہے کہ شاید تہمت لگانے والا سچا ہو لیکن چار گواہ جمع نہ ہوسکنے کی وجہ سے اس پر حد قائم کر دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی بیویوں کا مقام و مرتبہ اس شک و شبہ سے بلند و بالا بنایا ہے، لہٰذا سابقہ قانون کو چھوڑ کر خود ان کی براءت نازل کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیئت تھی، نہ جانے یہ بات منکرینِ حدیث کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی ؟

اعتراض نمبر ⑩ : ''بتایا جاتا ہے کہ یہ حضرت ام المؤمنین پر بہتان لگنے کا قصہ غزوۂ بنی المصطلق سے واپسی میں پیش آیا تھا، یہ غزوہ شعبان میں ہوا ہے۔ اگر پندرہ سولہ شعبان تک واپسی ہوگئی ہو تھی تو اس داستان کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تقریباً نصف رمضان تک بیمار رہیں اور اس پوری مدت میں آپ وحی کے منتظر رہے، اس سے لازم آتا ہے کہ تقریباً نصف رمضان تک حضورِ اکرم ﷺ کی جبرئیل سے ملاقات نہ ہوئی ہو، حالانکہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ ہر سال ماہِ رمضان کی ہر شب میں آپ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آ کر قرآن سنتے سناتے تھے، لہٰذا نہایت سہولت کے ساتھ آپ اس کے متعلق حضرت جبرئیل علیہ السلام سے حقیقتِ حال معلوم کر سکتے تھے۔'' («مطالعہ»: ١/١٥٥-١٥٦)

جواب : ⑩ میرٹھی صاحب یقیناً وحی کا صحیح مفہوم سمجھ نہیں پائے، ان کے نزدیک شاید جبریل علیہ السلام عالم غیب تھے اور نبی کریم ﷺ جب چاہتے جبریل علیہ السلام کو بلا کر سب حالات دریافت فرما لیتے تھے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام بلکہ تمام فرشتے مل کر بھی اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے بغیر کچھ نہ جانتے تھے، نہ ہی علم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کسی کو بتانے کے اتھارٹی کسی فرشتے کے پاس تھی، جبریل علیہ السلام سو بار بھی آپ کے پاس آئے ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی یہ تھی کہ اصل حقیقت کو دیر سے آشکارا کیا جائے، لہٰذا جبریل علیہ السلام کو پہلے پتہ بھی تھا تو وہ بتا نہ سکتے تھے، وہ جس کام کے لیے آتے تھے، صرف وہی کرتے تھے، اس دوران کسی اور وحی کا انکار کس نے کیا ہے، صرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اتنے دن وحی نازل نہیں ہوئی، جیسا کہ وہ خود بیان کرتی ہیں: وقد لبث شهرا ، لا یوحی الیه فی شأنی بشئ .

''آپ ایک ماہ تک یوں رہے کہ میرے بارے میں آپ کی طرف کوئی وحی نازل نہیں کی گئی۔''

(صحیح بخاری : ٤١٤١)

اس لیے نہایت سہولت کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے، کوئی اعتراض والی بات ہے، ہی نہیں!

اعتراض نمبر ⑪ : ''صحیح بات یہ ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد ہی غزوۂ بنی المصطلق ہوا تھا۔ اچھا فرض کر لیجیے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنی وفات سے نو دس ماہ بعد یکا یک زندہ ہو کر اس وقت مسجد کے اندر مجمع میں آ گئے تھے اور حضورِ اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر اپنی دلی محبت کا ثبوت دیا اور بہتان لگانے والوں کو گردن زدنی قرار دیا تھا اور سعد بن عبادہ جیسے جلیل القدر صحابی پر اس وقت خاندانی تعصب کا بھوت چڑھ گیا تھا تو مہاجرین کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے اس موقع پر ایک لفظ بھی نہ کہا، حالانکہ اس داستان کے مطابق مہاجرین میں سے دو شخص اس جرمِ عظیم کے مرتکب ہو رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' (((مطالعہ)) : ١٦٣/١)

جواب : میرٹھی صاحب نے غزوۂ احزاب کے پہلے اور غزوۂ بنی المصطلق کے بعد میں ہونے پر اتفاق کا جو جھوٹا دعویٰ کیا تھا، اس کا تو ہم پول کھول چکے ہیں اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ غزوۂ احزاب بعد میں ہوا تھا، لہٰذا ان کو اس جھوٹ پر جھوٹ ''فرض'' کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، رہی بات یہ کہ مہاجرین میں سے دو صحابہ اس کام میں شریک ہوئے تھے تو مہاجرین نے وہاں کوئی بات کیوں نہ کی اور رسولِ کریم ﷺ سے محبت کا اظہار کیوں نہ کیا تو اس کا جواب سیدھا سا ہے کہ میرٹھی صاحب خود لکھ چکے ہیں:

''اس کے نتیجہ میں مسجد میں شور بر پا ہو گیا اور بنی اوس اور بنی خزرج باہم لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔'' («مطالعہ» : ۱/۱٦٤)

بلکہ صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی ہیں: **فثار الحيّان الأوس والخزرج حتّى همّوا ورسول الله صَلَّى الله عليه وسلّم على المنبر ، فنزل ، فخفّظهم حتّى سكتوا وسكت .**

''اوس اور خزرج دونوں قبیلے بھڑک اٹھے یہاں تک کہ انہوں نے (لڑائی کا) ارادہ کر لیا، رسولِ کریم ﷺ منبر پر تھے، آپ نیچے تشریف لائے اور ان کو ٹھنڈا کیا، حتی کہ وہ بھی خاموش ہو گئے اور آپ بھی خاموش ہو گئے۔'' (صحيح بخاری : ٤١٤١)

معلوم ہوا کہ وہاں پہلے ہی شور بر پا ہو گیا تھا اور رسولِ کریم ﷺ لوگوں کو خاموش کروا رہے تھے، ایسے حالات میں مہاجرین وہاں رسولِ کریم ﷺ کا حکم مان کر خاموش رہ گئے تھے، بھلا وہاں مہاجرین کا نہ بولنا حبِ رسول کی علامت تھی یا بولنا؟ قارئین ہی فیصلہ فرمائیں کہ اس میں صحیح بخاری کا قصور ہے یا منکرینِ بخاری کا؟

اعتراض نمبر ⑫ : ''یہاں ناظرین داستانِ افک کی روایات کے اس اختلاف پر بھی نظر ڈال لیں کہ زہری کی داستان کے مطابق حضرت عائشہ ؓ کو اپنے متعلق بہتان کی خبر تقریباً ایک ماہ بعد ہوئی تھی جب بخار اتر گیا تھا اور رات کو مسطح کی ماں کے ساتھ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر جنگل سے گھر کی طرف آ رہی تھیں۔ ابو اسامہ کی داستان میں بھی مسطح کی ماں کو ہی مخبر بتایا گیا ہے، مگر اس میں مذکور ہے کہ قضائے حاجت سے پہلے ہی ام المؤمنین کو مسطح کی ماں نے یہ جانکاہ اطلاع دے دی تھی، اس کے سنتے ہی ان پر لرزہ طاری ہو گیا اور حاجت کا کوئی احساس ہی نہ رہا، یوں ہی گھر واپس آ گئیں۔۔۔'' («مطالعہ» : ۱/۱٦٣-۱٦٤)

جواب : ناظرین کو معلوم ہو گا، اگر نہیں تو معلوم ہو جانا چاہیے کہ خود میرٹھی صاحب نے لکھا ہے:

''امام بخاری نے اسے بطورِ حدیث نہیں بلکہ زہری کی تائید میں تعلیقاً ذکر کیا ہے۔۔۔'' («مطالعہ» : ۱/۱۷۷)

ہمارا سوال ہے کہ جب امام بخاری ؒ نے اس کو بطورِ حدیث پیش ہی نہیں کیا تو صحیح بخاری کی احادیث پر اعتراضات کے ضمن میں اسے پیش کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ صحیح بخاری کی معلّق روایات ہمارا محلِّ نزاع ہیں ہی نہیں، بلکہ امت کا اجماع بخاری کی مرفوع متصل احادیث کی صحت پر ہے۔

معلوم ہوا کہ ابو اسامہ کی روایت کو پیش کر کے صحیح بخاری پر اعتراض کرنا محض ہٹ دھرمی ہے، علمی کاوش نہیں۔

اعتراض نمبر ⑬ : ''دوسرا اختلاف یہ ہے کہ ابواسامہ کی روایت میں تصریح ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے مسجد کے اندر بھرے مجمع سے جب اس قصہ کا ذکر کیا اور جواب میں سعد بن معاذ نے بہتان لگانے والوں کو قتل کرڈالنے کی اجازت مانگی اور اس کے جواب میں ایک خزرجی شخص نے بر بنائے تعصب سعد بن معاذ کی بات کا جواب دیا اور اس کے نتیجہ میں مسجد میں شور برپا ہوگیا اور بنی اوس اور بنی خزرج باہم لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے تو اس وقت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر ہی تھیں جو بالکل مسجد سے متصل تھا، لیکن ام المؤمنین کو یہ بات بالکل معلوم نہ ہوئی کہ مسجد میں شور کیسا ہے اور کس بات پر لوگ جھگڑ رہے ہیں تو کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کان میں شور کی آواز نہ پہنچے اور آپ کو اس کی حقیقت جان لینے کا تجسّس نہ ہو؟ (((مطالعہ)) : ١٦٤/١)

جواب : صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق مسجد میں آپ ﷺ کے صحابہ سے بات چیت کرنے سے پہلے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو امِ مسطح کی زبانی اس واقعہ کا علم ہو چکا تھا، جبکہ مسجد والے واقعہ کے وقت آپ رضی اللہ عنہا اپنے والدین کے گھر تھیں، نیز ایک معلّق روایت کی بنا پر صحیح بخاری پر اعتراض کرنا جہالت ہے، کیونکہ معلق روایات صحیح بخاری کے موضوع سے ہی خارج ہیں۔

اعتراض نمبر ⑭ : ''ابواسامہ کی روایت میں ہے کہ اسی دن شام کو مسطح کی ماں سے حضرت عائشہ نے یہ خبر سنی، لیکن زہری کی روایت میں یہ ہے کہ جب حضرت عائشہ مسطح کی ماں سے خبر سن کر آپ سے اجازت لے کر تحقیقِ حال کے لیے اپنے تو دوسرے دن مسجد میں آپ نے لوگوں سے اس کا ذکر کیا اور سعد بن معاذ و سعد بن عبادہ کے درمیان تلخ کلامی ہوئی، یعنی اس وقت حضرت عائشہ اپنے گھر نہ تھیں، بلکہ والدین کے یہاں تھیں۔

اور ام رومان سے مروی داستان میں یہ مذکور ہے کہ وہ اپنی بیٹی حضرت عائشہ کے پاس حضورِ اکرم ﷺ کے یہاں گئی ہوئی تھیں کہ ایک انصاریہ عورت آ کر اپنے بیٹے کو کوسنے لگی۔۔۔ اس روایت کے مطابق حضرت عائشہ کو یہ خبر حضور ﷺ کے گھر میں ہی اپنی ماں کے سامنے ایک انصاری عورت سے معلوم ہوئی تھی، تینوں روایتوں کا یہ اختلاف نا قابلِ حل ہے اور یہ بجائے خود اس قصہ کے غلط ہونے کی دلیل ہے۔ (((مطالعہ)) : ١٦٥/١)

جواب : میرٹھی صاحب نے یہاں صحیح بخاری کی روایات میں تعارض و منافات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ در حقیقت صحیح احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہوسکتا، ہاں! بسا اوقات ظاہری طور پر کسی کو کوئی منافات نظر آتی ہے، حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے اور ایسا تو کئی قرآنی آیات میں بھی ہے، بھلا اس وجہ

سے قرآنی آیات پر بھی اعتراض کیا جائے گا؟

ابواسامہ کی روایت تو ہے ہی معلق، لہٰذا اس پر اعتراض فضول ہے، رہی بات امام زہری ؒ کی روایت کی کہ اس میں سیدہ عائشہ ؓ کے والدین کے گھر جانے کے بعد دوسرے دن مسجد میں رسولِ کریم ﷺ کے خطاب کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ عائشہ ؓ نے یہ مسجد والا معاملہ خود نہیں سنا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سیدہ عائشہ ؓ اپنے والدین کے گھر سے فوراً واپس آ گئی تھیں، جیسا کہ خود میرٹھی صاحب نے لکھا ہے:

''جب حضرت عائشہ اپنے والد کے یہاں پہنچیں تو حضرت ابوبکر نے انہیں واپس جانے کی سخت تاکید کی، وہ حضور ﷺ کے یہاں اپنے گھر میں واپس آ گئیں، دوسرے دن صبح کو ابوبکر وام رومان دونوں ان کے یہاں پہنچ گئے اور شام تک وہیں رہے۔۔۔'' («مطالعہ» : ۱/۱۱۶۔۱۶۷)

یہ اعتراض تو ان کے گھر سے ہی رفع ہو گیا ہے، رہا معاملہ یہ کہ ایک روایت میں سیدہ عائشہ ؓ کو ام مسطح کی طرف سے گھر سے باہر اطلاع ملنے کا ذکر ہے اور دوسری روایت میں یہ ذکر ہے کہ سیدہ عائشہ ؓ کی والدہ رسولِ کریم ﷺ کے گھر میں موجود تھیں کہ انصار کی ایک عورت نے آ کر سیدہ عائشہ ؓ کو اطلاع دی، اس تعارض کا حل کرتے ہوئے حافظ ابنِ حجر ؒ فرماتے ہیں:

وطريق الجمع بينهما أنّها سمعت ذلك أوّلاً من أمّ مسطح ، ثمّ ذهبت الىٰ بيت أمّها لتستيقن الخبر منها ، فأخبرتها أمّها بالأمر مجملاً .... ثمّ دخلت الأنصاريّة ، فأخبرتها بمثل ذلك بحضرة أمّها ، فقوى عندها القطع بوقوع ذلك ، فسألت هل سمعه أبوها وزوجها ترجيا منها أن لا يكونا سمعا ذلك ، ليكون أسهل عليها ، فلمّا قالت لها : انّهما سمعاه ، غشى عليها.....

''دونوں روایات میں تطبیق یہ ہے کہ سیدہ عائشہ ؓ نے پہلے یہ خبر امّ مسطح سے سنی، پھر وہ اس کی تصدیق کے لیے اپنی والدہ کے پاس چلی گئیں، انہوں نے مختصر انداز سے بات بتائی، پھر جب انصار کی ایک عورت نے ان کی والدہ کی موجودگی میں آ کر یہ خبر دی تو سیدہ عائشہ ؓ کو اس واقعہ کا قطعی یقین ہو گیا، پھر انہوں نے اس عورت سے پوچھا، کیا ان کے والد (سیدنا ابوبکر صدیق ؓ) اور خاوند (رسولِ کریم ﷺ) نے بھی یہ خبر سنی ہے؟ آپ کو امید یہ تھی کہ ان کو یہ خبر نہیں پہنچی ہوگی، لہٰذا یہ معاملہ خفیف ہوگا، لیکن جب عورت نے بتایا کہ انہوں نے بھی یہ بات سن لی ہے تو (پریشانی کی وجہ سے) آپ پر غشی طاری ہو گئی۔۔۔''

(فتح الباری : ۸/۴٦۷۔۴٦۸)

کتنی واضح سی بات ہے جو حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے سمجھا دی ہے، عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ خبر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو کئی ذرائع سے ملی، جب ایک عام عورت نے خبر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ بات پہنچ گئی ہے تو آپ فرطِ غم سے بے ہوش ہو گئیں، اس میں بھلا عقلی طور پر کون سی خرابی اور کون سا تعارض ہے جو نا قابل حل ہے؟ اگر کوئی آدمی حق کو تسلیم نہ کرنے کی ٹھان لے تو بھلا قرآنِ کریم میں ایک ایک واقعہ میں اسے تعارض نظر نہیں آئے گا؟ ایک مثال پیشِ خدمت ہے:

سورۂ ق میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۝﴾ (ق: ۳۸) ''اور یقیناً ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، اسے چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ بھی نہیں ہوئی۔''

جبکہ سورۂ حم السجدہ میں یوں فرمان ہے: ﴿قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْأَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗ أَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا أَقْوَاتَهَا فِيْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِيْنَ ۝ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ ...﴾ (حم السجدہ: ۹۔۱۲)

''(اے نبی!) کہہ دیجئے، کیا تم اس ذات کے ساتھ کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا فرمایا اور تم اس کے لیے شریک ٹھہراتے ہو، وہ تو سب جہانوں کا رب ہے، اور اس نے اس (زمین) میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس نے اس میں برکت دی اور اس نے اندازہ رکھا اس میں اس کی غذاؤں کا چار دنوں میں، سوال کرنے والوں کے لیے یہ برابر ہے، پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ کی، اس حال میں کہ وہ دھواں تھا، چنانچہ اس نے آسمان اور زمین کو کہا کہ تم دونوں خوشی یا ناخوشی آؤ، دونوں نے کہا، ہم خوشی سے آتے ہیں، پس اس نے دو دنوں میں سات آسمان بنائے۔۔۔''

اب پہلے مقام پر اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، سب کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا تذکرہ فرمایا ہے، جبکہ دوسرے مقام پر دو دنوں میں زمین، چار دنوں میں زمین کی اندرونی چیزوں اور دو دنوں میں آسمانوں کو بنانے کا تذکرہ کیا ہے، یوں ظاہراً آٹھ دن بنتے ہیں، کیا کوئی عقل مند انسان کہہ سکتا ہے کہ (معاذ اللہ!) یہ نا قابل حل اختلاف ہے؟

ظاہر ہے کہ اگر آدمی اسے حق تسلیم کرے تو اپنی عقل کا قصور سمجھے گا اور کوئی نہ کوئی توجیہ کر کے ضرور اسے

قبول کرلے گا، لیکن اگر وہ اس حق کا مخالف ومنکر ہوا تو اسے یہی بات اقرارِ حق میں رکاوٹ نظر آئے گی، بعینہٖ یہی معاملہ حدیث کا ہے، جب اس کے راویوں اور سندوں پر آنے والے تمام اشکالات رفع کردیئے گئے ہیں تو صرف اپنی عقلِ نارسا کو معیار قرار دے کر ٹھکرانا تعصب کے سوا کچھ نہیں۔

اعتراض نمبر ⑮ : ''پس زہری کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کے والدین اور ایک انصاری عورت کی موجودگی میں حضرت ابوبکر کے گھر یہ آیات نازل ہوئیں۔

لیکن ابواسامہ کی داستان میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والد کے یہاں پہنچیں تو حضرت ابوبکر نے انہیں واپس جانے کی سخت تاکید کی، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اپنے گھر واپس آ گئیں، دوسرے دن صبح کو ابوبکر و ام رومان دونوں ان کے یہاں پہنچ گئے اور شام تک وہیں رہے، عصر کی نماز پڑھ کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے ۔۔۔۔پس ابواسامہ کی روایت کے مطابق یہ آیات خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اتری تھیں اور ام المؤمنین وہیں ابوبکر کے یہاں سے واپس آ گئیں تھیں اور ان کے والدین ابوبکر وام رومان بھی موجود تھے۔

لیکن ام رومان والی روایت میں مذکور ہے کہ انصاریہ عورت سے بہتان کی خبر سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بے ہوش ہو کر گر گئیں، ہوش آیا تو انہیں سخت جاڑا بخار تھا۔۔۔۔حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر باہر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر بعد ابوبکر کے ساتھ واپس آئے اور اللہ کی طرف سے ام المؤمنین کی بے گناہی کی صراحت آ جانے کی بشارت دی، پس اس روایت کے مطابق یہ آیات حضرت عائشہ وام رومان کے سامنے نہیں، بلکہ گھر سے باہر نازل ہوئیں۔

بتایئے تینوں روایتوں کے مضمون کے اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے؟ اگر تین شخص بجائے خود نہایت ثقہ ہوں اور وہ کسی امر کے بارے میں گواہی دیں، لیکن تینوں کا بیان باہم متضاد ہو تو کیا ان کی وہ شہادت قابل قبول ہوگی؟ ہرگز نہیں، اختلاف وتناقض کی وجہ سے تینوں کی شہادت رد کر دی جائے گی، اسی طرح یہ تینوں روایتیں گو صحیح بخاری میں درج ہیں، لیکن جب ایک ہی واقعہ کے متعلق ان کے مضامین میں باہم اس قدر اختلاف و تناقض ہے تو مقتضائے عقل یہی ہے کہ تینوں روایتیں رد کر دی جائیں اور باور کیا جائے کہ یہ افسانہ سرے سے غلط ہے۔۔۔'' («مطالعہ»: ١٦٦/١-١٦٨)

جواب : ① فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَّلَا جَانٌّ﴾ (الرحمٰن: ٣٩)

’’اس (قیامت کے) دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں پوچھا نہیں جائے گا۔‘‘

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَا ذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ﴾(القصص : ٦٥)

’’اور وہ (اللہ تعالیٰ) ان کو پکارے گا اور فرمائے گا تم نے میرے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟‘‘

کیا (معاذ اللہ!) ان فرامین باری تعالیٰ کے بارے میں کہا جائے گا کہ ’’بتایئے ان آیات کے مضمون کے اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے؟ جب ایک ہی واقعہ کے متعلق ان کے مضامین میں باہم اس قدر اختلاف و تناقض ہے تو مقتضائے عقل یہی ہے کہ دونوں کو رد کر دیا جائے اور باور کیا جائے کہ یہ افسانہ سرے سے غلط ہے۔۔۔‘‘ کیونکہ ایک آیت میں مذکور ہے کہ قیامت کے روز کسی انس و جن سے اس کے گناہوں کے بارے میں پوچھا ہی نہیں جائے گا، بلکہ ویسے ہی سزا لاگو کر دی جائے گی، جبکہ دوسری کئی آیات میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں اور اپنے انبیاء کے نافرمانوں سے پوچھے گا۔

جب قرآن کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ اس میں کوئی تعارض نہیں، اگر کہیں ایسی بات نظر آئے تو انسانی عقل کا قصور ہے تو حدیثِ نبوی کو اس طرح کے حیلے بہانوں سے کیوں چھوڑا جاتا ہے؟ حالانکہ قرآن کی طرح نبی کریم ﷺ کے اقوال و افعال پر بھی عمل ضروری ہے، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الاحزاب : ٢١)

’’تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں اچھا نمونہ ہے۔‘‘

کیا آپ ﷺ کی زندگی کا یہ واقعہ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ نہیں، پھر اس کو ٹھکرانے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے، محض عقل کو معیار بنا کر حدیثِ رسول اور اجماعِ امت کا انکار کر کے خیر القرون سے لے کر اب تک کے تمام مسلمانوں کو بے عقل و بے شعور قرار دینے کی مذموم سعی کی جا رہی ہے، کیا تمام سلف صالحین اتنا بھی شعور نہیں رکھتے تھے کہ (معاذ اللہ!) ایک جھوٹے افسانے کو عقیدے و عمل میں بنیادی حیثیت دیتے رہے؟

④ یہ کہنا کہ زہری کی روایت میں ذکر ہے کہ آیاتِ براءت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر میں نازل ہوئیں، بالکل خلافِ واقعہ بات ہے، کوئی منکرِ حدیث ہمت کر کے امام زہری کی روایت میں یہ بات دکھائے تو سہی، اصل بات وہی ہے جو ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب واقعہ افک کی تحقیق کرنے اپنے والدین کے گھر گئی تھیں تو اپنی والدہ سے پوچھ کر فوراً واپس آ گئی تھیں، جیسا کہ زہری اور ابواسامہ دونوں کی روایت میں ہے: وأصبح أبواى عندى . ’’صبح کے وقت میرے والدین میرے پاس آ گئے۔‘‘

اگر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زہری کی روایت کے مطابق والدین کے گھر میں ہی تھیں تو پھر ان کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہوا کہ میرے والدین صبح کے وقت میرے پاس آئے؟

رہا امّ رومان رضی اللہ عنہا والی روایت کے بارے میں میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہ ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر باہر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر بعد ابوبکر کے ساتھ واپس آئے۔۔۔پس اس روایت کے مطابق یہ آیات حضرت عائشہ وامّ رومان کے سامنے نہیں بلکہ گھر سے باہر نازل ہوئیں۔۔۔''

تو یہ زبردست علمی خیانت ہے، ہے کوئی منکرِ حدیث جو اس خیانت کو دیانت ثابت کرتے ہوئے اس واقعہ کے تحت صحیح بخاری میں سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا باہر جانا، پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس آنا اور راستے میں آیاتِ براءت کا نازل ہونا دکھا کر اپنے میرٹھی صاحب کی عزت بچالے؟

معلوم ہوا کہ صحیح بخاری کی اس روایت میں بھی باقی دونوں روایات کی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہی ان آیات کے نزول کا تذکرہ ہے، نیز یہ تمام اعتراضات نیک نیتی اور دین فہمی کی غرض سے نہیں، بلکہ حدیث ومحدثین دشمنی کے نظریئے سے کیے گئے ہیں، کیونکہ جھوٹ تو جھوٹے لوگ ہی بولتے ہیں؟

رہے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ : **وانصرف ولم یقل شیئاً ، فأنزل اللّٰہ عذری ...**

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھرے اور کچھ نہیں کہا، پھر اللہ تعالیٰ نے میری براءت نازل فرمادی۔۔۔''

تو **انصرف** کا معنیٰ ہر وقت کسی جگہ سے نکلنا نہیں، بلکہ اکثر اس کا معنیٰ توجہ ہٹا کر دوسری طرف کرنا بھی ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کے مطالعہ سے ہی بیسیوں مقامات مل سکتے ہیں، بطورِ نمونہ ایک ملاحظہ فرمائیں:

عن عائشة رضی اللّٰہ عنہا أنّ النّبیّ صَلَّی اللّٰہ علیہ وسلّم صلّی فی خمیصة لھا أعلام ، فلمّا انصرف قال : اذھبوا بخمیصتی ھٰذہ ... فانّھا ألھتنی آنفا عن صلاتی ...

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دھاری دار چادر میں نماز پڑھی، جب آپ نماز سے پھیرے تو فرمایا، میری یہ چادر لے جاؤ۔۔۔کیونکہ اس نے مجھے ابھی نماز سے غافل کردیا تھا۔۔۔''

(صحیح بخاری : ۳۷۳)

کیا یہاں کوئی **انصرف** کا معنیٰ یہ کرسکتا ہے کہ ''جب آپ گھر سے باہر تشریف لے گئے تو فرمایا''؟

صاف صاف بات ہے کہ یہاں اس کا معنیٰ نماز سے توجہ ختم کرکے گھر والوں کی طرف توجہ مبذول کرنا ہے اور یہی معنیٰ سیدہ امّ رومان رضی اللہ عنہا والی حدیثِ افک میں ہے جس کو سمجھنے کی بجائے میرٹھی صاحب نے اس

واقعی واقعہ کو ''سرے سے غلط افسانہ'' قرار دے دیا ہے۔

اعتراض نمبر ⑯ : ''زہری وابواسامہ دونوں کی روایت میں مذکور ہے کہ حضرت ام المؤمنین پر بہتان لگانے کی سرپرستی تو منافق اعظم عبداللہ بن اُبی کررہا تھا اور مخلص مؤمنین میں سے بھی تین شخص اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تھے، ایک مشہور شاعر حضرت حسان بن ثابت انصاری خزرجی، دوم مسطح بن اثاثہ مہاجر بدری جو خاندانِ بنی مطلب میں سے تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا اور غریب ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکر اس کی مالی امداد فرماتے رہتے تھے، اس نے بھی ام المؤمنین پر یہ ظلم کیا تو حضرت ابوبکر نے آئندہ کے لیے اس کی مالی مدد کرنے سے ہاتھ کھینچ لیے تھے، سوم حمنہ بنتِ جحش مہاجرہ صحابیہ۔ ان تینوں نے کھل کر حضرت ام المؤمنین پر بہتان لگایا تھا اور محمد بن اسحاق مؤرخ کی روایت جس کی تخریج ابوداؤد نے کی ہے، یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں پر حدِ قذف جاری فرمائی۔

میں کہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ نہ حسان بن ثابت نے یہ جرم کیا تھا نہ مسطح بن اثاثہ نے نہ حمنہ نے، یہ ان پر دشمنوں کا بہتان ہی بہتان ہے جیسا کہ میں آگے چل کر وضاحت کے ساتھ ثابت کروں گا، یہاں میں یہ بتانے پر اکتفا کرتا ہوں کہ سورۂ احزاب سورۃ النور سے بہ اتفاقِ مفسرین پہلے نازل ہوئی ہے اور سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صراحت کے ساتھ بتا دیا تھا کہ ازواجِ مطہرات کا حکم و مرتبہ عام مؤمن عورتوں سے بہت مختلف اور نہایت بلند ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بیوی تمام مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی ماں ہے۔۔۔ اور انہیں خوب فہمائش کر دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینا خود اللہ کو اذیت دینے کے معنیٰ میں ہے، ایسے شخص پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور اس کے لیے ذلیل و رسوا کر دینے والا عذاب طے ہے۔۔۔ ان تصریحات کے ہوتے ہوئے کس مسلمان کی یہ مجال ہو سکتی تھی کہ حضرت ام المؤمنین پر بہتان باندھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچائے، کسی شریف و پارسا مسلمان عورت پر بہتان باندھنا گناہِ کبیرہ اور موجبِ حدِ قذف ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی پر بہتان باندھنا کفر اور موجبِ لعنت ہے، سخت حیرت کی بات ہے کہ حسان بن ثابت و مسطح بن اثاثہ و حمنہ بنتِ جحش کو مؤمن و مخلص بھی بتایا جائے اور ان کے متعلق یہ بھی باور کر لیا جائے کہ انہوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیوی پر بہتان باندھ کر وہ گناہ کر لیا ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دشمن سے دشمن مشرک یا یہودی نے بھی نہیں کیا، اگر کوئی شریف بیٹی اپنی شریف و پاکیزہ ماں پر بہتان لگا سکتی ہو تو حمنہ بنتِ جحش نے بھی لگا دیا ہوگا اور کوئی شریف بیٹا اپنی شریف ماں کو رسوا کرنے پر تل سکتا

ہوتو حسان اور مسطح نے بھی اس کا ارتکاب کرلیا ہوگا ۔۔۔‘‘ («مطالعہ»: ۱/۱۶۸۔۱۶۹)

جواب : ① قارئین کرام! ہم تو اس ادیبانہ کاوش پر بعد میں تبصرہ کریں گے، آپ ذرا وہ عبارت پہلے پڑھ لیں جو حق کو واضح کرنے کے لیے خود میرٹھی صاحب کی قلم سے اللہ تعالیٰ نے نکلوا دی ہے:

’’ہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حضرت حسان شاعر تھے، شاعر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ذکی الحس ہوتا ہے اور معمولی سی بات کو بڑی اہمیت دے ڈالتا ہے، جب منافقین نے چند پارسا مؤمن عورتوں کے خلاف طوفانِ افک اٹھایا تھا تو اس موقع پر حضرت حسان سے بھی ان کی ہمنوائی کی غلطی ہوگئی تھی، یعنی حسان بھی کسی پارسا مؤمن عورت کو بے ثبوت مطعون کر بیٹھے، اس کی سزا میں ان پر حدِ قذف نافذ ہوئی، وہ کون عورت تھی؟ نہ ہم اسے جانتے ہیں نہ اس کے جاننے سے کچھ حاصل ۔۔۔‘‘ («مطالعہ»: ۱/۱۸۳)

سبحان اللہ! ؎ تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

حدیثِ افک میں سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کا تہمت لگانے والوں میں شامل ہونا میرٹھی صاحب کو شانِ صحابیت کے سخت خلاف معلوم ہوا تھا، لیکن جب خود اسی صحابی کو ایک پاکدامن مؤمنہ عورت پر تہمت لگانے میں ملوث کیا تو اس سے نہ تو صحابیت میں کچھ فرق پڑا نہ بے گناہ پاکدامن عورت پر تہمت لگانے کے سلسلے میں قرآنی وعیدوں میں سے کسی پر نظر پڑی۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝﴾ (النور: ۲۳)

’’بلاشبہ وہ لوگ جو پاکدامن، بھولی بھالی، مؤمن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، وہ دنیا و آخرت میں لعنت کیے گئے ہیں اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔‘‘

﴿ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَّأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝﴾ (النور: ٤)

’’اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، پھر چار گواہ نہیں لاتے، ان کو اسّی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی بھی قبول نہ کرو اور یہی لوگ فاسق ہیں۔‘‘

یاد رہے کہ میرٹھی صاحب نے صرف ازواجِ مطہرات پر تہمت لگانے والے کو موجبِ لعنت ٹھہرایا ہے، جبکہ قرآنِ کریم کی زبانی عام مؤمن پاکدامن عورت پر تہمت لگانے والا بھی دنیا و آخرت میں لعنتی ہے۔

اب اگر کوئی آدمی میرٹھی صاحب سے بھی دو قدم آگے نکل کر کہہ دے کہ صحابیٔ رسول سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کی

نے کسی بھی پاکدامن عورت پر بہتان نہیں لگایا، ایسی باتیں محض افسانہ وجھوٹ ہیں اور تھوڑے بہت تصرف کے ساتھ میرٹھی صاحب والی گردان پڑھتے ہوئے وہ یہ کہہ دے کہ ''ان تصریحات کے ہوتے ہوئے کس مسلمان کی یہ مجال ہوسکتی ہے کہ وہ کسی شریف و پاکدامن عورت پر بہتان لگا کر دنیا وآخرت میں لعنت کا مستحق ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادہ اور فاسق قرار پائے؟''

نیز وہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ میرٹھی صاحب کے یہ الفاظ بھی نقل کردے کہ ''سخت حیرت وتعجب کی بات ہے حسان بن ثابت کو مؤمن ومخلص بھی بتایا جائے اور ان کے متعلق یہ بھی باور کرلیا جائے کہ انہوں نے ایک پاکدامن مؤمن عورت پر بہتان باندھ کر بالکل وہی گناہ کرلیا تھا جس میں صرف بڑے بڑے دشمنانِ اسلام منافقین ہی ملوث ہوئے تھے!''

اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہے کہ ''اگر کوئی غیرت منداور شریف بھائی اپنی شریف و پاکیزہ بہن کو رسوا کرنے پر تل سکتا ہو تو حسان نے بھی اپنی اسلامی بہن کے خلاف اس جرم کا ارتکاب کرلیا ہوگا!''

مزید برآں وہ جنگِ جمل کی صورت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی لڑائی کا بھی ذکر کرے جس کے ابھی تک میرٹھی صاحب بھی اقراری ہیں(«مطالعہ» : ۱۸۰/۱)(آنے والے دنوں میں شاید یہ واقعہ بھی ان کی عقل میں نہ سمائے اور وہ اسے بھی جھوٹا افسانہ قرار دے دیں!)، پھر وہ یوں عبارت بنائے کہ ''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مؤمنوں کی ماں ہیں، والدین کو تو قرآن نے اُف بھی کہنے سے منع کردیا ہے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ والدین کی رضا میں اللہ کی رضا اور والدین کی ناراضی میں اللہ کی ناراضی ہے، کوئی شریف ومؤمن بیٹا تو اپنی والدہ کو اس کی زیادتی کے باوجود اُف تک بھی نہیں کہہ سکتا، حیرت وتعجب کی بات ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مؤمن ومخلص بھی بتایا جائے اور ان کے متعلق یہ بھی باور کرلیا جائے کہ انہوں نے اس ہستی کے خلاف سرعام بازارِ جنگ گرم کرلیا تھا جس کو قرآن نے سب مؤمنوں کی ماں کہا ہے، اگر کوئی حلال زادہ اور شریف بیٹا اپنی ماں کو علی الاعلان رسوا کرنے پر تل سکتا ہو تو مان لیں گے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا ارتکاب کرلیا ہوگا!''

تو میرٹھی صاحب کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ جو جواب وہ اس سوال کا دیں گے، وہی ہماری طرف سے واقعۂ اِفک میں کیے گئے اپنے اعتراض کا سمجھ لیں۔

(۴) جس بات کو ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، وہ یہ ہے کہ انسان ہونے کے ناطے کچھ مسلمان بھی منافقین کی باتوں میں آگئے اور ان کی ہمنوائی کی غلطی ان سے ہوگئی، جس کو اللہ تعالیٰ نے معاف بھی کردیا،

خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کے بعد بھی سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کو سچا پکا مسلمان سمجھتی تھیں اور ان کو برا بھلا کہنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں، بلکہ ایسا کرنے والے کو ان کے مخلص و مؤمن ہونے کی دلیل کے طور پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دفاع میں ان کے اشعار سناتیں۔(صحیح بخاری: ٤١٤١)

رہا یہ سوال کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینے والے کے لیے دنیا و آخرت میں لعنت کی وعید سنائی گئی ہے تو پھر سیدنا حسان اور دوسرے اشخاص جو اس واقعہ میں ملوث ہوئے تھے، ان کو ہم مخلص و مؤمن کیسے سمجھتے ہیں؟

اس کا جواب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے جھوٹی تہمت لگانے والوں کی سزا بیان کرتے ہوئے سورۂ نور میں ہی دے دیا ہے، فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾

''ہاں! جو لوگ اس کے بعد توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو بلا شبہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔''

پھر اس بات پر سب مسلمانوں کا اجماع بھی ہے کہ سب صحابہ جنتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں ہی ان سے راضی ہوگیا تھا، اتنی سی بات تھی جس کے سمجھ میں نہ آنے نے میرٹھی صاحب کو انکارِ حدیث پر اکسا دیا!

جاری ہے۔۔۔

❀❀❀❀❀❀❀

قرض سے نجات اور حرام سے بچنے کی دعا

ابن نذیر نور پوری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ کلمات سکھلائے:

اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِکَ عَنْ حَرَامِکَ وَأَغْنِنِی بِفَضْلِکَ عَمَّنْ سِوَاکَ.

''اے اللہ! تو مجھے اپنی حلال کردہ اشیاء کیساتھ حرام اشیاء سے کافی ہو جا اور اپنے فضل کیساتھ اپنے علاوہ ہر ایک سے بے نیاز کردے۔'' (جامع ترمذی: ٣٥٦٣، مسند الامام احمد: ١٥٣/١، المستدرك للحاكم: ٧٢١/١، المختارة للضياء المقدسی: ٤٩٠، وسندهٗ حسن)

تنبیہ: عبدالرحمن بن اسحاق الرّاوی عن سیّار أبی الحکم، هو عبدالرّحمن بن اسحاق المدنی القرشیّ، لا الکوفیّ، کما هو مصرّح فی روایة أحمد والحاکم والمختارة، ولا یغترّ أحد بترجمة الکوفی فی «تهذیب الکمال» حیث ذکر فی شیوخه سیّار أبو الحکم والرّاوی عنه أبو معاویة أیضاً موجود، لکن لو رجع راجع الی «الجرح والتعدیل» لابن أبی حاتم لوجد عکس ذٰلك حیث ذکر سیّار أبو الحکم فی شیوخ الأنصاری القرشیّ المدنیّ، لا الواسطیّ الکوفیّ، وکذالك الرّاوی عنه أبو معاویة ذکر فی ترجمة المدنیّ، لا الکوفیّ، فوهم الحافظ المزّی فی ترجمة المدنی والکوفی، فافهم وتدبّر!)

فطرانہ ادا کرنا فرض ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے (رمضان المبارک میں) مسلمانوں کے غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر ایک صاع کھجور یا جو فطرانہ فرض قرار دیا ہے۔'' (صحیح بخاری: ۱۵۰۳، صحیح مسلم: ۹۸٤)

ثابت ہوا کہ مسلمان غلام پر فطرانہ فرض ہے، نہ کہ کافر پر، اگر کوئی کہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **ليس فی العبد صدقة الّا صدقة الفطر .**

''غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، مگر صدقۂ فطر (واجب) ہے۔'' (صحیح مسلم: ۹۸۲)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث عام ہے اور مذکورہ بالا حدیثِ ابنِ عمر خاص ہے، خاص کو عام پر مقدم کیا جاتا ہے۔

فائدہ : ① حجازی صاع دو سیر چار چھٹانک کا ہوتا ہے، اس کا اعشاری وزن 2.099 بنتا ہے۔

② سیدنا قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: **أمرنا رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم بصدقة الفطر قبل أن تنزل الزّكاة ، فلمّا نزلت الزّكاة لم يأمرنا ولم ينهنا ، ونحن نفعله .** ''زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر ادا کرنے کا حکم دیا، جب زکوٰۃ کا حکم نازل ہو گیا تو آپ ﷺ نے نہ ہمیں حکم دیا اور نہ ہی منع فرمایا، البتہ ہم اسے ادا کرتے تھے۔''

(مسند الامام احمد: ٦/٦، سنن النسائی: ۲۵۰۹، سنن ابن ماجہ: ۱۸۲۸، السنن الکبریٰ للبیہقی: ٤/۱۵۹، وسندہٗ صحیح)

اس حدیث کو امام ابنِ خزیمہ (۲۳۹٤) رحمہ اللہ اور امام حاکم (۱/٤۱۰) رحمہ اللہ نے ''صحیح'' کہا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

حافظ خطابی رحمہ اللہ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

وهذا لا يدلّ على زوال وجوبها ، وذلک أنّ الزّيادة فی جنس العبادة لا يوجب نسخ الأصل المزيد عليه ، غير أنّ محلّ الزّكوات الأموال ومحلّ زكاة الفطر الرّقاب .

''یہ حدیث صدقۂ فطر کے وجوب کے ختم ہونے پر دلالت نہیں کرتی، کیونکہ عبادت کی جنس میں زیادت اصل کے منسوخ ہونے کو واجب نہیں کرتی، نیز (ایک فرق یہ بھی ہے کہ) زکوٰۃ مالوں پر فرض ہوتی ہے اور صدقۂ فطر جانوں پر۔'' (معالم السنن : ٢/٢١٤)

③ خوراک کی جو جنس استعمال میں آتی ہے، مثلاً گندم، جو، کھجور، پنیر، کشمش وغیرہ، بہتر تو یہ ہے کہ اس میں سے فی کس ایک صاع فطرانہ ادا کیا جائے، ہاں! یاد رہے کہ روپے پیسے یا چاندی وغیرہ کی صورت میں بھی فطرانہ ادا کیا جا سکتا ہے۔

❁ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ليس به بأس أن يعطى زكاة رمضان فضة .**

''صدقۂ فطر چاندی کی صورت میں ادا کرنے میں کوئی حرج والی بات نہیں۔''

(تاريخ ابن معين : ٢٣٢٦، ٢٧٦٥)

④ صدقۂ فطر نمازِ عید سے پہلے ادا کیا جائے، سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرانہ روزہ دار کی لغویات اور فحش گوئی سے روزہ کو پاک کرنے کے لیے اور مساکین کو کھانا کھلانے کے لیے فرض کیا ہے، جو اسے نمازِ عید سے پہلے ادا کر دے، اس کی طرف سے قبول ہوگا اور جو نمازِ عید کے بعد ادا کرے گا، وہ عام صدقات میں سے ایک عام صدقہ ہے۔''

(سنن ابی داوٗد : ١٦٠٩، سنن ابن ماجه : ١٨٢٨، وسندهٔ حسن)

اس حدیث کو امام حاکم (٤٠٩/١) رحمہ اللہ نے ''صحیح'' کہا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

⑤ صدقۂ فطر عید سے ایک دو دن پہلے بھی ادا کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ امام ایوب سختیانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں، میں نے نافع سے پوچھا کہ سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کب صاع ادا کرتے تھے تو نافع رحمہ اللہ نے کہا، جب عامل (صدقہ وصول کرنے والا) بیٹھ جاتا، میں نے کہا، وہ کب بیٹھتا تھا؟ نافع رحمہ اللہ نے فرمایا، عید الفطر سے ایک دو دن پہلے بیٹھتا تھا۔'' (صحیح ابن خزیمة : ٢٣٩٧، وسندهٔ صحیح)

⑥ خوب یاد رہے کہ فطرانہ صرف مساکین کا حق ہے۔

(مجموع الفتاوى لابن تيميه : س٢٥/٧١-٧٨، زاد المعاد لابن القيم : ٢/٤٤)

یہ سلفی العقیدہ، متشرع اور نمازی مسلمانوں کا حق ہے، اہل حق کے دینی مدارس پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے، بدقسمتی سے ہمارے ہاں مسلمانوں کا قیمتی مال دین کے نام پر ''سرکاری''، تنظیمیں، تحریکیں کھا جاتی ہیں، مستحقین

محروم رہ جاتے ہیں۔

⑦ فطرانہ کا مقصد دورانِ روزہ ہونے والی کمی وکوتاہی کی معافی، بے فائدہ اور فحش کلامی کی تطہیر اور عید کے دن باوقار طریقے سے مساکین کو دربدر ٹھوکریں کھانے سے بچانا ہے، فطرانہ شکرانہ کی بہترین اور بے مثال صورت ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا باعث ہے، گھر میں خیر وبرکت اور امن وسکون کا باعث ہے، ہر قسم کی برائی اور شر سے بچنے کا محفوظ راستہ ہے، اس سے باہمی مودّت ورحمت جنم لیتی ہے، نفرتوں اور کدورتوں کا قلع قمع ہوتا ہے، انسانی ہمدردی کا شاندار مظاہرہ ہوتا ہے اور باوقار معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمارے گناہوں کو معاف کر کے ہمیں اپنے صالحین بندوں میں شامل فرمالے۔ آمین!

❀❀❀❀❀❀❀

اس بات پر اجماع ہے کہ بوڑھا آدمی، جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، وہ روزہ نہ رکھے، بلکہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ دیکھیں (الاجماع لابن المنذر : ۱۲۹)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''وہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں، وہ ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔'' (صحیح بخاری : ٤٥٠٥)

نیز آپ رضی اللہ عنہما نے آیتِ کریمہ ﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾ (البقرة : ١٨٤) پڑھی اور فرمایا: ''بوڑھا شخص جو روزہ رکھنے کی استطاعت وطاقت نہ رکھتا ہو، روزہ نہ رکھے، بلکہ روزانہ ایک مسکین کو آدھا صاع گندم دے دے۔'' (سنن الدارقطنی : ٢/٢٠٧، ح : ٢٣٦١، وسندهٗ حسن)

ایک روایت میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''ایک مد (تقریباً آدھا کلو) دے گا۔''

(سنن الدارقطنی : ٢/٢٠٤، ح : ٢٣٤٩، وقال : اسناد صحيح، وهو كما قال)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ جب وہ ایک سال روزہ رکھنے سے عاجز آ گئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے ایک ٹب میں ثرید تیار کی، تیس مساکین کو خوب سیر کر کے کھلا دی۔

(سنن الدارقطنی : ٢/٢٠٦، ح : ٢٣٦٥، وسندهٗ صحيح)

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کا روزہ

غلام مصطفےٰ ظہیر امن پوری

اللہ رب العزت کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے لیے آسان ترین دین کا انتخاب کیا ہے اور ان کو رخصتوں سے نوازا ہے، حاملہ عورت اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت کو یہ رخصت عنائت فرمائی ہے کہ کہ اگر وہ اپنی جسمانی کمزوری یا اپنے بچے کی کمزوری یا دودھ میں نقصان کا خدشہ محسوس کریں تو روزہ نہ رکھے، بلکہ ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے، اس پر قضاء بھی نہیں ہے، جیسا کہ سیدنا انس بن مالک الکعبی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أغارت علينا خيل رسول اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم فأتيت رسول اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم ، فوجدتّه يتغدّى ، فقال : ادن ، فكل ، فقلت : انّى صائم ، فقال : ادن أحدّثك عن الصّوم أو الصّيام ، انّ اللّٰه تعالىٰ وضع عن المسافر الصّوم وشطر الصّلاة ، وعن الحامل أو المرضع الصّوم أو الصّيام ، واللّٰه ! لقد قالهما النّبىّ صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم كلتيهما أو احداهما ، فيا لهف نفسى ! أن لا أكون طعمت من طعام النّبىّ صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم .

''ہم پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑے چڑھ آئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے، آپ نے فرمایا، قریب ہو اور کھا، میں نے عرض کی، میں روزے دار ہوں، فرمایا، قریب ہو جا کہ میں تجھے روزے یا روزوں کے بارے میں بتاؤں، یقیناً اللہ تعالیٰ نے مسافر کو روزہ اور آدھی نماز معاف کر دی ہے، نیز حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی روزہ یا روزے معاف کر دیئے ہیں، اللہ کی قسم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں کلمات (روزہ یا روزے) کہے یا ان دونوں میں سے ایک کہا، افسوس کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا نہ کھایا!''

(سنن ابی داوٗد : ۲٤۰۸، سنن النسائی : ۲۲۷۹، سنن الترمذی : ۷۱۵، واللفظ له ، سنن ابن ماجه : ١٦٦٧، حسن)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن'' اور امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ (۲۰٤٤) نے ''صحیح'' کہا ہے۔

❁ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایسی حاملہ عورت کے بارے میں پوچھا گیا جسے اپنے بچے کے نقصان کا خطرہ ہو، آپ نے فرمایا، وہ روزہ چھوڑ دے، اس کے بدلے میں ایک مسکین کو ایک ''مد'' (تقریباً

نصف کلوگرام) گندم دے دے۔(السنن الکبریٰ للبیهقی: ۲۳۰/٤، وسندهٔ صحیح)

❁ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک حاملہ عورت نے روزے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: أفطری ، وأطعمی عن کلّ یوم مسکیناً ولا تقضی .

''تو روزہ چھوڑ دے اور ہر دن کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے، پھر قضائی نہ دے۔''

(سنن الدارقطنی: ۲۰۷/۱، ح: ۲۳٦۳، وسندهٔ صحیح)

❁ نافع بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک بیٹی ایک قریشی کے نکاح میں تھی، وہ حاملہ تھی، رمضان میں اس نے پیاس محسوس کی تو آپ نے اسے حکم دیا کہ روزہ چھوڑ دے، ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔(سنن الدارقطنی: ۲۰۷/۱، ح: ۲۳٦٤، وسندهٔ صحیح)

❁ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمانِ باری تعالیٰ ﴿ وعلی الّذین یطیقونه فدیة ﴾(البقرة: ۱۸٤) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: أثبتت للحبلٰی والمرضع . ''یہ آیت حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لیے ثابت (غیر منسوخ) رکھی گئی ہے۔''(سنن ابی داوٗد: ۲۳۱۷، وسندهٔ صحیح)

❁ عظیم تابعی سعید بن جبیر رحمہ اللہ حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت جو اپنے بچے کے حوالے سے خائف ہو، کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ دونوں روزہ نہ رکھیں، ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، چھوڑے ہوئے روزے کی قضائی بھی ان دونوں پر نہیں ہے۔

(مصنف عبد الرزاق: ۲۱٦/٤، ح: ۷۵۵۵، وسندهٔ صحیح)

بعض اہل علم کا یہ کہنا کہ یہ دونوں روزے کی قضائی بھی دیں گی، بے دلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہے۔

الحاصل : حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت دونوں روزہ نہ رکھیں، ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، ان پر کوئی قضائی نہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁

اعتذار

ماہنامہ **السنّة** شمارہ نمبر ⑩ صفحہ نمبر ⑫ سطر نمبر ㉒ میں کمپوزنگ کی غلطی سے ''شبیب بن سعید'' کے بجائے ''شعیب بن سعید'' لکھا گیا ہے، قارئین کرام تصحیح فرمالیں۔ شکریہ

****

میت کی طرف سے روزوں کی قضائی

غلام مصطفٰے ظہیر امن پوری

اگر کسی نے روزوں کی نذر مانی ہو اور اس کو پورا کرنے سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کی طرف سے یہ روزے اس کا ولی رکھے گا، جیسا کہ

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من مات وعليه صيام ، صام عنه وليّه . ''جو آدمی فوت ہو جائے، اس حال میں کہ اس کے ذمّہ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے۔'' (صحیح بخاری : ۱۹۵۲، صحیح مسلم : ۱۱۴۷)

❀ عمرہ سے روایت ہے: **أنّ أمّها ماتت وعليها من رمضان ، فقالت لعائشة : أقضيه عنها ؟ قالت : لا ، بل تصدّقي عنها وكان كلّ يوم نصف صاع على كلّ مسكين .**

''ان کی ماں فوت ہو گئی، اس پر رمضان کے روزے باقی تھے، اس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا، کیا میں اپنی ماں کی طرف سے ان کی قضائی دوں؟ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، نہیں، بلکہ ہر روزے کے بدلے کسی مسکین پر ایک صاع گندم صدقہ کر۔''

(مشكل الآثار للطحاوی : ۱۴۲/۳، وسندهٗ صحيح ، المحلی لابن حزم : ۴/۷، واللفظ له ، وسندهٗ صحيح)

اس حدیث کا مفہوم راویۂ حدیث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فرمان سے واضح ہو گیا کہ اس حدیث سے نذر کے روزے مراد ہیں، نہ کہ رمضان کے، راوی اپنی روایت کو بہتر جانتا ہے۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

هذا في النّذر ، وهو قول أحمد بن حنبل . ''یہ (حدیث) نذر کے (روزوں کے) بارے میں ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔'' (سنن ابی داوٗد ، تحت حدیث : ۲۴۰۰)

حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے عموم کی تخصیص یہ حدیث بھی کر رہی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

جاء رجل الى النّبيّ صَلَّى اللّٰه عليه وسلّم ، فقال : يا رسول اللّٰه ! انّ أمّي ماتت وعليها صوم شهر ، أفأقضيه عنها ؟ قال : نعم ، فدين اللّٰه أحقّ أن يقضٰى .

''ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے اللہ کے رسول! میری امی فوت ہو گئی ہیں، ان پر ایک مہینے کے روزے ہیں، کیا میں ان کی طرف سے قضائی دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں! اللہ تعالیٰ کا قرض ادائیگی کا زیادہ حق رکھتا ہے۔'' (صحیح بخاری: ۱۹۵۳، صحیح مسلم: ۱۱۴۸)

بخاری و مسلم میں یہ الفاظ بھی ہیں: **وعليها صوم نذر .** ''اس پر نذر کے روزے ہیں۔''

❁ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: **انّ سعد بن عبادة رضی الله عنه استفتٰی رسول الله صَلَّی الله علیه وسلّم ، فقال : انّ أمّی ماتت وعلیها نذر ، فقال : اقضه عنها .**

''سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے رسولِ کریم ﷺ سے فتویٰ طلب کیا کہ میری والدہ فوت ہو گئی ہیں، ان پر نذر کے روزے تھے، آپ نے فرمایا، ان کی طرف سے قضائی دے۔''

(صحیح بخاری: ۲۷۶۱، صحیح مسلم: ۱۶۳۸)

یہ حدیث نص ہے کہ میت کی طرف سے نذر کے روزے رکھے جائیں گے۔

❁ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسے انسان کے بارے میں پوچھا گیا جو فوت ہو گیا ہو اور اس پر نذر کے روزے تھے تو آپ نے فرمایا: **یصام عنه النّذر .**

''اس کی طرف سے نذر کے روزے رکھے جائیں گے۔'' (مصنف ابن ابی شیبة: ۶۵/۱/۴، وسندهٗ صحیح)

فائدہ : اگر مرنے والے پر رمضان کے روزوں کی ادائیگی ہو تو اس کی طرف سے روزہ نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس فرمان کے مطابق ہر روزے کے بدلے آدھا صاع یا ایک مد گندم ولی صدقہ کرے گا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ (مسائل الامام احمد بروایة ابی داوٗد: ص ۹۶)

امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔

سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: **لا یصلّی أحد عن أحد ولا یصوم أحد عن أحد ، ولکن یطعم عنه ، فکان کلّ یوم مدّا من حنطة .**

''کوئی کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ کوئی کسی کی طرف سے روزہ رکھے، بلکہ (روزے کے بدلے میں) ہر دن ایک مد گندم صدقہ کرے۔'' (السنن الکبرٰی للنسائی: ۲۹۱۸، وسندهٗ صحیح)

میت کی طرف سے نذر کے روزوں کے علاوہ ولی روزے نہیں رکھ سکتا، کیونکہ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اسی

بات کے قائل ہیں کہ میت کے طرف سے نذر کے روزے رکھے جائیں۔

الحاصل : میت پر نذر کے روزے ہوں تو اس کا ولی ان کی قضائی دے گا، اگر رمضان کے روزے ہوں تو ولی ہر روزے کے بدلے میں آدھا صاع یا ایک مد گندم کسی مسکین پر صدقہ کرے گا۔

مقلدین نبیٔ اکرم ﷺ، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی مخالفت میں کہتے ہیں:

ولا يصوم عنه الوليّ . ''ولی میت کی طرف سے نذر کے روزے نہیں رکھے گا۔''

(الهداية مع الدراية ، كتاب الصوم : ٢٠٣/١)

قارئین کرام! انصاف شرط ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کی حدیث کو لیں گے یا فقہ حنفی کو؟

السنّة کے ساتھ تعاون کیجئے

قارئین کرام! آپ دینی رسائل وجرائد کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں ان کا کردار آپ پر مخفی نہیں، اسی ضرورت کے پیشِ نظر ماہنامہ **السنّة** کا اجرا کیا گیا ہے، جو کہ اپنا ایک سال مکمل کرنے کو ہے، اسے علماء وعوام کی طرف سے یکساں پذیرائی ملی ہے، یہ معاشرے کی ایک بڑی دینی ضرورت کو پورا کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ ایک مستند رسالہ ہے، جو ہر قسم کی ضعیف روایات واقوال سے پاک ہے، اس کی تیاری میں ہمیں ایک جامع لائبریری کی اشد ضرورت ہے، ایک ایک حوالہ کے لیے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا ہے، اس کی باقاعدہ اور معیاری طباعت پر خطیر رقم صرف ہوتی ہے، اگر آپ ہمارے منہج سے متفق ہیں اور ہماری کوشش پر مطمئن ہیں تو ہم آپ کے تعاون کے یقیناً مستحق ہیں، یہ آپ کا اپنا رسالہ ہے، اس کے ساتھ مالی معاونت جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں آتی ہے، لہٰذا آپ اپنی زکوٰۃ اور صدقات وخیرات کی صورت میں اس سے تعاون کریں۔

یقیناً آپ کا اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوا مال دنیا وآخرت میں کام آئے گا۔

کیا غسلِ حیض سے پہلے مجامعت جائز ہے؟

غلام مصطفٰی ظہیر امن پوری

حیض سے پاک ہونے کے بعد غسل سے پہلے جماع درست نہیں۔

اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

﴿ وَيَسْـئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ﴾(البقرہ: ۲۲۲)

''وہ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، فرما دیجئے کہ وہ ناپاکی ہے، تم دورانِ حیض عورتوں سے علیحدہ رہو(جماع نہ کرو)، پاک ہونے تک(جماع کی نیت سے) ان کے قریب نہ جاؤ، جب وہ(نہا کر) اچھی طرح پاک ہو جائیں، تو حکمِ الٰہی کے مطابق ان کے پاس آؤ۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

وقد اتّفق العلماء علیٰ أنّ المرأة اذا انقطع حیضها لا تحل حتّٰی تغتسل بالماء أو تتیمّم إن تعذّر ذلک علیها بشرطه ، الّا أنّ أبا حنیفة رحمه اللّٰه ....

''علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت خونِ حیض رکنے کے بعد اس وقت تک مرد کے لیے حلال نہیں ہوتی، جب تک پانی سے غسل نہ کر لے یا مجبوری کی صورت میں تیمّم نہ کر لے، سوائے ابوحنیفہ کے(وہ غسل کو ضروری خیال نہیں کرتے)۔''(تفسیر ابن کثیر:۱/۳۵۰)

معلوم ہوا کہ اس آیت میں ﴿حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ سے مراد ''خونِ حیض کا رکنا'' اور ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ سے مراد ''غسل کرنا'' ہے۔

جلیل القدر تابعی امام عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اذا انقطع عنها الدّم فلا یأتیها ، حتّٰی تطهر ، فاذا طهرت فلیأتها کما أمر اللّٰه . ''جب عورت کا خونِ حیض رک جائے تو بھی غسل کرنے تک اس کا خاوند(جماع کے لیے) اس کے پاس نہ آئے، جب وہ غسل کر چکے، تو حکمِ الٰہی کے مطابق اس سے صحبت کر لے۔''(مصنف ابن ابی شیبہ:۱/۹۶، ۹۷، وسندہٗ حسن)

عظیم تابعی مجاہد بن جبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا يقربها زوجها حتیّٰ تغتسل . ”جب تک وہ (حائضہ) غسل نہ کرے، اس کا خاوند، (جماع کی نیت سے) اس کے قریب نہ آئے۔“ (سنن دارمی:۱۱۱۷، مصنف ابن ابی شیبہ: ۹۶/۱، وسندہٗ صحیح)

امام مکحول تابعی فرماتے ہیں: لا يغشى الرّجل المرأة اذا طهرت من الحيضة حتّٰى تغتسل .
”عورت کے حیض سے پاک ہونے کے بعد غسل کرنے سے پہلے مرد جماع نہیں کرسکتا۔“
(مصنف ابن ابی شیبہ: ۹۶/۱، وسندہٗ صحیح)

امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو فرمایا:
لا ، حتیّٰ تغتسل . ”نہیں! غسل سے پہلے (جماع درست نہیں)“ (سنن دارمی: ۱۱۲۷، وسندہٗ صحیح)

امام طحاوی حنفی رحمہ اللہ (م ۳۲۱ھ) لکھتے ہیں:

ولا نعلم فى هٰذا التّأويل اختلافاً بين أهل العلم ، وانقطاع الدّم ليس بطهر فى نفسهٖ ، لأنّها وإن خرجت بهٖ من الحيض فانّها غير مباح لزوجها جماعها وغير مباح لها الصّلاة والطّواف بالبيت حتّٰى تغتسل بالماء أو تيمّم بالصّعيد عند عدم الماء ...

”ہمارے علم کے مطابق اس تفسیر (تَطَهَّرْنَ سے مراد غسل کرنے) میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں، خون کا رُکنا بذاتِ خود پاکی نہیں ہے، کیونکہ خون رکنے سے وہ حیض سے تو نکل گئی ہے، لیکن خاوند کے لیے اس سے جماع جائز نہیں، اسی طرح نماز اور بیت اللہ کا طواف بھی جائز نہیں، تا آنکہ پانی سے غسل نہ کرلے یا پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمّم نہ کرلے۔“ (أحکام القرآن للطحاوی: ۱۲۷/۱)

امام ابن المنذر رحمہ اللہ (م ۳۱۸ھ) رقمطراز ہیں:

والّذى بهٖ أقول ما عليه جمل أهل العلم ، أن لا يطأ الرّجل زوجتهٗ إذا طهرت من المحيض حتیّٰ تطهر بالماء ، واللّٰه أعلم . ”میرا وہی مذہب ہے، جو تمام اہل علم کا ہے کہ مرد اپنی بیوی سے اس وقت تک جماع نہیں کرسکتا، جب تک وہ پانی سے (غسل کرکے) طہارت حاصل نہ کرلے۔“
(الأوسط لابن المنذر: ۲۱۵/۲)

کسی صحابی یا تابعی سے اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں۔

الحاصل : حیض سے پاک ہونے کے بعد غسل سے پہلے جماع درست نہیں۔

۞۞۞۞۞۞۞